دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۹ ماہ شعبان المعظم ۱۴۳۳ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۲ء عدد ۶

فہرست مضامین

شذرات

مئی میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے دوحہ جانے کا اتفاق ہوا۔ دوحہ مملکت قطر کا دارالسلطنت ہے۔ رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے یہ ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ لیکن خطہ کی سیاست اور عالمی منظرنامہ میں قطر کا کردار اس سے کہیں زیادہ اہم ہے جس کی عام طور سے اس رقبہ اور آبادی کے کسی ملک سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مملکت تیل اور گیس کے ذخائر سے مالا مال ہے۔ اس وقت اس کا شمار ان چند ممالک میں ہے جن کی GDP کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ خطہ کے ممالک میں امیر ترین ملک ہونے کا اعزاز بھی اس کو حاصل ہے۔ لیکن اس سے بھی صورت حال کی پوری وضاحت نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ امیر قطر شیخ حمد بن خلیفہ الثانی کی قیادت میں قطر جن اصلاحات سے روشناس ہو چکا ہے، خطہ کے بہت سے ممالک ابھی ان سے آشنا نہیں ہیں۔ آزاد میڈیا کی حیثیت سے جو مقام ''الجزیرہ'' کو حاصل ہے مغربی ممالک سے باہر میڈیا سے متعلق کسی اور ادارہ کو حاصل نہیں۔ ماضی قریب میں کئی علاقائی اور بین الاقوامی امور میں مصالحت کار کی حیثیت سے قطر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ حکومت کی سرپرستی میں اور حکومتی اداروں کے ذریعہ اہم مسائل پر عالمی سطح کی کانفرنسوں کا انعقاد بھی حکومت قطر کی دلچسپی کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ WTO کی ایک اہم کانفرنس جس کو عام طور سے دوحہ راؤنڈ (Doha Round) کے نام سے شہرت حاصل ہوئی دوحہ میں منعقد ہوئی۔ Building Bridges کے سلسلہ کی پہلی کانفرنس دوحہ میں ہوئی۔ گذشتہ کچھ برسوں سے وقت کے بعض نہایت اہم اور حساس مسائل پر آزادانہ مباحثہ کے لیے ہر سال Doha Debate کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ وزارت خارجہ کی طرف سے گذشتہ بارہ برسوں سے نہایت وسیع اور اعلیٰ پیمانہ پر Enriching Middle East's Economic Future کے موضوع پر ایک سالانہ کانفرنس کا اہتمام کیا جارہا ہے۔ دوحہ کا سفر اسی کانفرنس میں شرکت کے لیے تھا۔

اس کانفرنس کا دائرہ کار بنیادی طور پر شرق اوسط تک محدود ہے۔ شرق اوسط کے حالات اور معاملات کے اثرات کسی نہ کسی سطح پر پوری دنیا میں محسوس کیے جاتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے دنیا بھر سے مندوبین مدعو کیے جاتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں استقبالیہ شیخ حمد بن جاسم بن جبر الثانی نے پیش کیا جو مملکت کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ ہیں۔ افتتاح امیر قطر ہز ہائی نس شیخ

حمد بن خلیفہ الثانی نے کیا ۔ افتتاحی اجلاس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے سری لنکا کے صدر اور سینیغال کے سابق صدر رونق افروز تھے ۔ دوسرے اجلاسوں میں جن اہم شخصیات نے حصہ لیا ان میں دانش وروں اور اسکالرس کے علاوہ عالمی سیاسی شخصیات ، میڈیا سے وابستہ افراد اور متعدد بڑے تجارتی اداروں کے عہدے دار شامل تھے ۔ جو سیاسی شخصیات اس میں شریک تھیں ان میں جارج مشل ، وزیر خاجہ ، الجیریا ، وزیر خارجہ ، تیونس ، وزیر خارجہ ، بحرین ، وزیر اطلاعات ، یمن ، سابق صدر پناما ، اٹلی کی سینیٹ کے نائب صدر ، سابق وزیر خارجہ ، برطانیہ ، سابق وزیر خارجہ ، اسپین ، سفراء اور مختلف ممالک کے ممبران پارلیمنٹ شامل تھے ۔ جن مسائل پر خصوصی توجہ مرکوز رہی ان میں ڈیولپمنٹ ، جمہوریت ، میڈیا ، تجارت ، معاشیات ، مسئلہ فلسطین ، بہار عرب ، مشرق وسطیٰ میں امن کے امکانات جیسے اہم مسائل شامل تھے ۔ گفتگو کھلے ماحول میں ہوئی اور مسائل کا گہرائی اور باریک بینی سے تجزیہ کیا گیا ۔ شرکاء کو بحث وتنقید کا پورا موقع فراہم کیا گیا ۔ آخری اجلاس کی صدارت شیخ احمد بن محمد بن جبر الثانی نے کی جو مملکت کے نائب وزیر خارجہ ہیں اور وزارت خارجہ میں کانفرنسز کے متعلق مجلس قائمہ کے چیرمین ہیں ۔

کانفرنس کے دوران جو موضوع سب سے زیادہ مرکز توجہ بنا وہ تعلیم کا مسئلہ تھا ۔ یہ بات ابھر کر سامنے آئی کہ اعلیٰ تعلیم میں امتیاز اور انفارمیشن ٹکنالوجی میں مہارت کے بغیر اب کسی ملک اور قوم کو قوموں کی برادری میں عزت اور سرفرازی نہیں حاصل ہوسکتی ۔ مستقبل میں صرف وہ قومیں کامیاب اور کامران ہوں گی جو اپنی آیندہ نسلوں کو بہترین تعلیم سے آراستہ کرسکیں گی ۔ اس سلسلہ میں بعض نئی اور دلچسپ اصطلاحات بھی سامنے آئیں مثلاً Talentism اور Meritocracy ان کا مطلب یہ ہے کہ آنے والے دور میں لیاقت اور صلاحیت کامیابی کی واحد کلید ہوگی ۔ بہار عرب کے امکانات اور مضمرات پر، تفصیلی گفتگو ہوئی ۔ متعدد شرکاء کو اس اصطلاح پر اعتراض تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اہل مغرب کی اس خواہش کی غماز ہے کہ یہ انقلاب کامیابی سے ہم کنار نہ ہو ۔ وہ امید کرتے ہیں جس طرح کچھ ہی دنوں بعد بہار خزاں میں تبدیل ہوجاتی ہے اسی طرح اس انقلاب کے اثرات بھی جلد ہی زائل ہوجائیں گے ۔ اس کے بالمقابل عرب بیداری یا عرب نشاۃ ثانیہ سے اس صورت حال کی زیادہ بہتر ترجمانی ہوتی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس اصطلاح کی جڑیں یوروپ کی تاریخ میں پیوست ہیں ۔ ۱۸۴۸ء میں یوروپ کے متعدد ممالک ایک ہمہ گیر انقلاب کی زد میں تھے ۔ اسے Spring of Nations یا

Springtimes of the People کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ انقلاب ناکام رہا۔ اہل مغرب عرب دنیا میں ہونے والی غیر معمولی اتھل پتھل کے لیے یہ اصطلاح شاید اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ یہ انقلاب بھی ناکام ہو جائے اور اس خطہ میں ان لوگوں کی حکمرانی باقی رہے جو مغربی مفادات کی پاسبانی کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔

دوحہ میں قیام کی مدت مختصر تھی۔ مزید براں کانفرنس کا پروگرام صبح سے شام تک چلتا رہتا تھا۔ اس لیے اس بات کی گنجائش کم ہی تھی کہ وہاں اکیڈمی کے بہی خواہوں سے رابطہ قائم کیا جاسکے۔ اس کے باوجود اللہ کے فضل سے برادر عزیز ابونافع اعظمی صاحب اور عزیزی عبدالرحمٰن شمسی کے تعاون اور کوششوں سے اس کے اسباب بھی پیدا ہوئے۔ ان دونوں عزیزوں کے ذریعہ کئی احباب ہوٹل میں ملنے کے لیے تشریف لائے جن میں ڈاکٹر عبدالحئی صاحب، حسیب الرحمٰن مجیب ندوی صاحب، ابوسعد ندوی صاحب، قیام الدین اصلاحی صاحب اور عبدالمعبود عثمانی صاحب شامل ہیں۔ عبدالرحمٰن شمسی صاحب کی دلچسپی اور کوشش سے حلقہ رفقاء ہند میں ایک نشست کا بھی اہتمام کیا گیا جہاں علامہ شبلیؒ اور دارالمصنّفین کی خدمات کے تعارف کا موقع ملا۔ اس نشست میں اچھی تعداد میں لوگ شریک ہوئے۔ یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں عامر عثمانی صاحب اور مطیع الرحمٰن حنیف فلاحی صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ عامر عثمانی صاحب کی توجہ اور کوشش سے اکیڈمی کے لیے وزارت اوقاف کی قیمتی مطبوعات کا حصول ممکن ہوسکا۔ پروگرام بعد عشاء تھا اور اس کے بعد حسیب الرحمٰن ندوی صاحب کے یہاں کھانے پر جانا تھا اس لیے خواہش کے باوجود وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ممکن نہ ہوسکا۔ حسیب الرحمٰن ندوی صاحب کے یہاں کئی احباب اور بہی خواہان دارالمصنّفین سے ملاقات کا موقع ملا جن میں عبدالرب عمری صاحب، محمد شاہد خاں صاحب، سید رفیع الدین عمری صاحب، طارق سلیم فلاحی صاحب اور انگریزی روزنامہ Peninsula کے نوجوان صحافی محمد شعیب صاحب شامل تھے۔ ان احباب کے ساتھ رات گئے تک اکیڈمی کے سلسلہ میں گفتگو ہوتی رہی۔ رحمت اللہ ندوی صاحب نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شہرۂ آفاق تصنیفات ''سیرت عائشہ'' اور ''خطبات مدراس'' کو عربی قالب عطا کیا ہے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور کچھ دیر ساتھ رہا اور موضوع گفتگو دارالمصنّفین رہا۔ چنانچہ وقت کی کمی کے باوجود اس مختصر سفر سے اکیڈمی کے تعلق سے نئے امکانات روشن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان سب بھائیوں کو اس کے لیے بہترین اجر سے نوازے۔

مقالات

رسول کریم ﷺ کی تاریخ وفات

فیروز الدین احمد فریدی

رسول کریمؐ کی تاریخ وفات آپؐ کے ہم عصر ہی بتا سکتے تھے لیکن سیرت النبیؐ (جلد دوئم) میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ ''کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی مجھ کو کوئی روایت احادیث میں نہیں مل سکی'' (۱)، یہ بھی کم حیرت کی بات نہیں کہ آپؐ کی وفات کے ڈیڑھ سو سال گزرنے کے بعد جب آپؐ کی پہلی مفصل سوانح عمری (۲) لکھی گئی، جو اکیسویں صدی عیسوی میں بھی موجود ہے تو اس میں آپؐ کے یوم ولادت، یوم وفات اور تاریخ ولادت (۱۲/ربیع الاول) سب کا ذکر ہے۔ اگر نہیں ہے تو تاریخ وفات کا۔

تاریخ وفات کی طرح، آپؐ کی تاریخ ولادت کے بارے میں بھی کوئی حدیث نہیں ہے یہ امر قابل فہم ہے۔ جب آپؐ پیدا ہوئے تو بھلا کون انسان جانتا تھا کہ یہ یتیم بچہ بڑا ہو کر کیا بنے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے ذکر کو کیا رفعت دے گا۔ اس وقت آپؐ کی تاریخ پیدائش کون یاد رکھتا؟ یہی وجہ ہے کہ آج جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کے مشہور سیرت نگار قاضی سلیمان منصور پوری کی مقبول کتاب ''رحمۃ للعالمین'' میں ۹/ربیع الاول (۳) کو خاصی تفصیل اور بہت وثوق سے آپؐ کی تاریخ ولادت لکھا گیا ہے، یا جب یہ پڑھتے ہیں کہ دوسری صدی ہجری میں آپؐ کے مشہور سوانح نگار ابن اسحاق نے کسی سند کا حوالہ دیے بغیر ۱۲/ربیع الاول (۴) کو آپؐ کی تاریخ ولادت قرار دیا، یا جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں ۱۷/ربیع الاول اور بیشتر مسلم ممالک میں ۱۲/ربیع الاول کو عید میلاد النبیؐ کے طور پر منایا جاتا ہے تو اکیسویں صدی عیسوی کا مسلمان حیران ہوتا ہے کہ ۹، ۱۲ یا ۱۷ ربیع الاول میں کیا صحیح ہے۔

کھتوال ہاؤس، 54-A، گلی نمبر ۱۵، باتھ آئی لینڈ، کراچی، ۷۵۵۳۰ پاکستان۔

یہ تو تاریخ ولادت کی بات ہوئی لیکن جب تاریخ وفات کی بات آتی ہے تو یہ پڑھ کر حیرانی دوچند ہوجاتی ہے کہ ''کتب حدیث کا تمام تر دفتر چھان ڈالنے کے بعد بھی تاریخ وفات کی کوئی روایت احادیث میں'' کیوں نہیں؟

جب آپؐ دنیا سے رخصت ہوئے تو آپؐ کا نام پورے عرب میں گونج رہا تھا اور آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ کی تعداد ہزاروں میں تھی، جن سے ہزاروں احادیث مروی ہیں، آپؐ کی وفات کے صرف بارہ برس بعد، جب ایران، عراق، شام، فلسطین اور مصر جیسے مشہور ممالک جنہیں اس وقت وہی مقام حاصل تھا، جو آج یورپ اور امریکا کو ہے، اسلامی حکومت کا حصہ بنے، اس وقت بھی آپؐ کے ہزاروں صحابہؓ زندہ تھے۔ کیا وجہ ہے کہ اس لمبے عرصے کے دوران اور بعد میں بھی، ان میں سے کسی ایک صحابی کے حوالے سے، اس موضوع پر ایک حدیث نہیں ملتی؟ کیا اس طویل عرصے کے دوران کسی مسلمان کو ان صحابہؓ سے یہ پوچھنے کی خواہش اور جستجو نہیں ہوئی؟ کیا انہیں خود کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس بارے میں بتانا چاہیے؟

اس ناقابل فہم بات کو سمجھنے کی سعی میں پہلی صدی ہجری، دوسری صدی ہجری، تیسری صدی ہجری اور آخر میں چودہویں صدی ہجری / بیسویں صدی عیسوی میں آپؐ کی تاریخ وفات کا جس طرح ذکر ہوا یا نہیں ہوا، اس کا مختصر سا جائزہ پیش ہے۔

پہلی صدی ہجری: دنیا کے قدیم ترین مجموعہ حدیث کا جو نسخہ (۵) بیسویں صدی عیسوی میں تحقیق اور تصدیق کے بعد بازیاب ہوا، وہ ہمام بن منبہ سے منسوب ہے۔ وہ روایتاً ۱۰۱ھ (۷۱۹ء) میں وفات پاگئے۔ یہ پہلی صدی ہجری کا اولین اور واحد، معلوم مجموعہ حدیث ہے، جو آج ہمارے پاس ہے۔ اس میں کل ۱۳۸ حدیثیں ہیں جو حضرت ابو ہریرہؓ کی سماعت نے براہ راست رسول کریمؐ کی زبان سے سنیں اور حضرت ابو ہریرہؓ سے براہ راست ہمام بن منبہ تک پہنچیں، جن کے درمیان کوئی دوسرا راوی نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا سال وصال ۵۸ھ (۶۷۸ء) بتایا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ۱۳۸ حدیثیں تقریباً پہلی نصف صدی ہجری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ہمام بن منبہ کو منتقل ہوگئی تھیں۔

یہ قدیم ترین مجموعہ احادیث دریافت کرنے اور اس کی ہر طرح تصدیق کرنے کے بعد

اسے شائع کرانے کی سعادت ڈاکٹر حمید اللہ کو ملی۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء) میں یہ نسخہ برلن (جرمنی) میں دیکھا اور بعد میں اس نسخے سے بھی کہیں قدیم تر قلمی نسخے کو دمشق (شام) میں تلاش کرلیا اور دونوں نسخوں کا مقابلہ کرنے کے بعد اسے ۱۹۵۳ء میں حیدرآباد (بھارت) سے شائع کرا دیا۔ نصف صدی بعد ۲۰۰۷ء میں یہ مجموعہ حدیث لاہور اور ملتان (پاکستان) سے بیک وقت شائع ہوا۔

اس مجموعہ حدیث میں رسول کریمؐ کی تاریخ وفات کا ذکر ہے، نہ یوم وفات کا اور نہ آپؐ کے آخری ایام، وفات، یا وفات کے بعد ہونے والے واقعات کا۔

دوسری صدی ہجری: فقہ، تاریخ نویسی اور تصنیف و تالیف کے اعتبار سے دوسری صدی ہجری بہت اہم ہے، سطور ذیل میں وہ آٹھ نام دیے جارہے ہیں، جو سب صاحب تصنیف تھے۔ جنہوں نے اپنی پوری عمر یا اس کا بیشتر حصہ دوسری صدی ہجری میں گزارا، جن میں سے بیشتر مدینے میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی اور بعض بزرگوں کی تو ساری زندگی مدینے میں گزری اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ ان میں سے کوئی بزرگ رسول کریمؐ کی تاریخ وفات کا ذکر کریں گے۔ یہ آٹھ مشہور نام یہ ہیں:

نمبر شمار و نام	ہجری سنین میں	عیسوی سنین میں	کتاب	تاریخ و وفات کا ذکر
۱-امام جعفر صادقؒ	۸۰ھ-۱۴۸ھ	۶۹۹ء-۷۶۵ء	--	نہیں کیا
۲-امام ابوحنیفہؒ	۸۰ھ-۱۵۰ھ	۶۹۹ء-۷۶۷ء	--	نہیں کیا
۳-ابن اسحاق	۸۵ھ-۱۵۱ھ	۷۰۴ء-۷۶۸ء	سیرۃ رسول اللہؐ	نہیں کیا، یوم وفات (پیر) کا ذکر ہے
۴-امام مالکؒ	۹۳ھ-۱۷۹ھ	۷۱۱ء-۷۹۵ء	موطا	نہیں کیا، یوم وفات (پیر) کا ذکر ہے
۵-امام شافعیؒ	۱۵۰ھ-۲۰۴ھ	۷۶۷ء-۸۲۰ء	--	نہیں کیا
۶-واقدی	۱۳۰ھ-۲۰۷ھ	۷۴۷ء-۸۲۲ء	المغازی	پہلی بار ۱۲/ربیع الاول کا ذکر کیا
۷-ابن ہشام	نامعلوم-۲۱۳ھ	نامعلوم-۸۲۸ء	سیرۃ النبیؐ	نہیں کیا، یوم وفات (پیر) کا ذکر ہے
۸-ابن سعد	۱۶۸ھ-۲۳۰	۷۸۴ء-۸۴۵ء	طبقات کبیر	۱۲/ربیع الاول کا ذکر ہے

ان آٹھ میں سے پانچ بزرگ یعنی امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، ابن اسحاق، امام مالک

اور واقدی ہم عصر تھے۔ امام شافعیؒ، واقدی، ابن ہشام اور ابن سعد بھی ہم عصر تھے، واقدی، ابن ہشام اور ابن سعد مورخ تھے، واقدی اور ابن سعد نے ۱۲/ ربیع الاول (۱۱ھ) کا ذکر آپؐ کی تاریخ وفات کے طور پر کیا۔ ابن ہشام نے نہیں کیا۔ اب ان آٹھوں بزرگوں کا مختصر ذکر ہو جائے۔

امام جعفر صادقؒ فقہ جعفریہ کے بانی ہیں۔ وہ حضرت ابو بکرؓ کے سگے سگڑ نواسے اور حضرت علیؓ کے سگے سگڑ پوتے تھے۔ وہ مدینے میں پیدا ہوئے، تقریباً پوری زندگی وہیں گزار دی اور وہیں دفن ہیں۔ وہ پہلے فقیہ ہی نہیں بلکہ معلم، محدث اور مصنف بھی تھے۔ رسول کریمؐ سے ان کا جو گہرا تعلق اور قریبی رشتہ تھا اور انہیں آپؐ سے جو محبت ہو سکتی ہے، وہ محتاج بیان نہیں، ان کی ننھیال اور ددھیال دونوں میں پانچ نسلوں سے رسول کریمؐ کا مستقل ذکر ہوتا ہوگا۔ کیا ان کے مدینے میں ۶۶ سالہ طویل قیام کے دوران، کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ کے جد امجد اور ہمارے نبیؐ کی تاریخ وفات پر کوئی مستند بات، اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود موجود نہیں ہے۔ اس بارے میں آپ کے خانوادے سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ اگر یہ بات نہیں بھی پوچھی گئی تو کیا امام جعفر صادقؒ نے خود اس خلا کو پر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، جو ایک صدی سے زیادہ عرصے سے موجود تھا؟

امام ابوحنیفہؒ فقہ حنفیہ کے بانی ہیں۔ ان کا قیام مدینے سے دور ضرور تھا لیکن وہ تاج دار مدینہ سے دور نہیں تھے۔ ان کے زمانے میں مدینے میں امام جعفر صادقؒ دین اور علم کی روشنی پھیلا رہے تھے، امام مالکؒ "موطا" ترتیب دے رہے تھے، ابن اسحاق "سیرت رسول اللہؐ" کا مواد جمع کرنے اور مسودہ تیار کرنے میں مشغول تھے۔ کیا امام ابوحنیفہؒ کے ہزاروں مقلدین میں سے کسی نے ان سے آپؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں نہیں پوچھا؟ کیا انہیں خود کبھی اس کا خیال نہیں آیا کہ اس باب میں اپنی اور اپنے عظیم محقق مریدوں کی محققانہ صلاحیتوں کا استعمال کریں؟

ابن اسحاق مدینے میں پیدا ہوئے اور خاصا عرصہ وہاں رسول کریمؐ کی سوانح عمری کے لیے بہت محنت اور محبت سے مواد جمع کرتے رہے۔ ان کی کتاب "سیرۃ رسول اللہؐ" آپؐ کی پہلی مفصل سوانح عمری ہے۔ ابن اسحاق رسول کریمؐ کی وفات کے پون صدی بعد پیدا ہوئے۔ جب انہوں نے "سیرۃ" لکھنا شروع کی ہوگی تو آپؐ کو اس جہان فانی سے گزرے ہوئے ایک صدی

سے زائد کا عرصہ گزر گیا ہوگا۔ آپؐ سے منسوب لاکھوں احادیث کی طرح، آپؐ کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کے بارے میں بھی مدینے میں بہت سی روایات، ممکن ہے کہ گردش کر رہی ہوں، اگر باہمی تعلقات میں کشیدگی کی وجہ سے ابن اسحاق کو امام مالک سے بات کرنے میں تامل تھا تو امام جعفر صادق سے پوچھ لینے میں کیا امر مانع تھا، جب کہ ابن اسحاق آپؐ کے بارے میں مرد ہو یا عورت ہر ایک سے پوچھتے تھے۔

ثانیاً جب ابن اسحاق نے ماخذ یا راوی کا ذکر کیے بغیر ۱۲/ ربیع الاول کو آپؐ کی تاریخ پیدائش کے طور پر لکھ دیا تو کیا وجہ ہے کہ آپؐ کا یوم وفات (پیر) لکھنے کے باوجود، اس کے ساتھ ہی آپؐ کی تاریخ وفات نہیں لکھی؟ یوم وفات کے ساتھ ہی تاریخ وفات کا لکھا ہونا فطری ہوتا۔

کیا اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ابن اسحاق کو آپؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں کوشش کے باوجود کوئی مستند روایت نہیں ملی؟ یہ عین ممکن ہے لیکن اس کا اطلاق تو آپؐ کی تاریخ وفات سے کہیں زیادہ آپؐ کی تاریخ ولادت پر ہونا چاہیے تھا۔ جس کی ابن اسحاق نے کوئی سند نہیں لکھی۔ آپؐ کی اولین مفصل سوانح عمری میں آپؐ کی تاریخ ولادت، یوم ولادت اور یوم وفات (بلکہ وقت وفات) کا اندراج اور صرف تاریخ وفات کا عدم اندراج، تاریخ کا زیادہ بڑا معمہ ہے۔

اب امام مالکؒ کی بات ہو جائے۔ وہ فقہ مالکیہ کے بانی ہیں۔ دوسری صدی ہجری کا واحد مجموعہ حدیث جو تیرہ سو سال کا انتہائی طویل، غیر محفوظ اور دشوار گزار سفر طے کرنے کے بعد آج بھی ہمارے پاس ہے، وہ امام مالک کی مرتب کردہ ''موطا'' ہے جس کے بارے میں فقہ شافعیہ کے بانی امام شافعی سے یہ قول (۷) منسوب ہے کہ آسمان کے نیچے، قرآن کے بعد ''موطا'' سے زیادہ صحیح کتاب کوئی نہیں ہے۔ یہ پہلا مجموعہ حدیث ہے جس میں پیر کو آپؐ کے یوم وفات کے طور پر درج کیا گیا ہے، تاہم تاریخ وفات کا ذکر اس میں بھی نہیں ہے۔

موطا کا زمانہ تالیف ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) ہے۔ یہ احادیث ہی نہیں بلکہ فقہ کا بھی مجموعہ اور منبع ہے اور ایک حد تک تاریخ کا ماخذ بھی۔ اس کی تالیف کا پس منظر یہ بتایا گیا ہے کہ عباسی خلیفہ منصور کے دور حکومت (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) میں عباسی خلافت ایشیا کے بہت بڑے حصے پر پھیل چکی تھی، اس وسیع و عریض سلطنت کے مختلف صوبوں (جو آج آزاد ممالک ہیں) میں

عدالتی فیصلوں کو شرعی احکام کے سانچے میں ڈالنے کے لیے ایک مستند اور جامع کتاب کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ ''موطا'' کی وجہ تالیف یہ بنی۔

موطا میں مختلف عنوانات کے تحت بہت سے ابواب ہیں لیکن رسول کریمؐ کی وفات کے بارے میں کوئی علاحدہ باب نہیں ہے، جب کہ آپؐ کی وفات کے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر، صحیح بخاری میں آپؐ کی علالت (۸)، آخری کلمات اور وفات کے بارے میں علاحدہ علاحدہ ابواب قائم کیے گئے ہیں۔

موطا کے دو ابواب جنہیں ''کتاب'' کا عنوان دیا گیا ہے، یہ ہیں:

۱-''کتاب الجنائز'' (۹) (ما جاء فی دفن المیت) اس میں درج ہے کہ آپؐ کی وفات پیر کے روز ہوئی۔

۲-''کتاب الجامع'' (۱۰) (ما جاء فی اجلاء الیہود من المدینہ) اس میں آپؐ کے یہ آخری کلمات درج ہیں کہ اللہ یہود و نصاریٰ کو تباہ کرے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بنا دیا اور پھر یہ فرمایا کہ عرب کی زمین پر دو دین نہ رہیں۔

موطا میں اپنے ہم عصر ابن اسحاق کی طرح امام مالک نے بھی صرف یوم وفات کا ذکر کیا ہے، تاریخ وفات کا نہیں۔ امام مالکؒ کی پوری زندگی مدینے میں گزری اور امام جعفر صادق کی طرح وہ بھی مدینے میں مدفون ہیں۔ اگر اپنی ۸۴ سالہ طویل مدنی زندگی کے دوران میں امام مالک نے آپؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی مستند حدیث سنی ہوتی تو یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وہ آپؐ کے یوم وفات (پیر) کی روایت تو موطا میں درج کر دیتے لیکن یوم وفات کے ساتھ ہی تاریخ وفات نہ لکھتے۔

امام شافعی فقہ شافعیہ کے بانی ہیں اور ایک علاحدہ مکتب فقہ کے بانی ہونے کے باوجود، وہ اپنے بزرگ ہم عصر اور فقہ مالکیہ کے بانی امام مالک کے انتہائی عقیدت مند شاگرد تھے۔ امام شافعیؒ کی عقیدت ان کے اس قول سے ظاہر ہے کہ آسمان کے نیچے قرآن کے بعد موطا سے زیادہ صحیح کتاب کوئی نہیں۔ یہ عقیدت اور شاگردی امام شافعی کے لڑکپن سے شروع ہوئی اور امام مالک کی وفات تک جاری رہی۔ امام شافعی کی والدہ فاطمہ امام حسینؓ کی سگی پرپوتی تھیں۔ امام شافعی کی

زندگی مکے، مدینے، بغداد اور قاہرہ میں گزری، جو علم حدیث کے ممتاز مراکز تھے۔

یہاں اس دلچسپ حقیقت کا ذکر ہو جائے کہ جیسے فقہ شافعیہ کے بانی ہونے کے باوجود، امام شافعی فقہ مالکیہ کے بانی امام مالک کے شاگرد اور مداح تھے، اسی طرح فقہ حنبلیہ کے بانی ہونے کے باوجود، امام احمد بن حنبل امام شافعی کے شاگرد اور مداح تھے اور مداحوں کی فہرست میں امام غزالی اور امام رازی جیسے نابغۂ روزگار بھی شامل ہیں۔ امام شافعی سے رسول کریمؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی روایت منسوب نہیں۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اپنی کئی جلدوں پر مشتمل ''مسند'' میں جو تقریباً ۳۰ ہزار احادیث پر مشتمل ہے، آپؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی روایت درج نہیں کی۔ دوسرے الفاظ میں امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ میں سے کسی نے بھی آپؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں کوئی روایت نہیں لکھی۔ امام احمد بن حنبلؒ کا مزید ذکر تیسری صدی ہجری کے ضمن میں آئے گا۔

اب مشہور مورخ واقدی کا ذکر ہو جائے۔ امام جعفر صادق، امام مالک اور ابن اسحاق کی طرح ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی بھی مدینے میں پیدا ہوئے۔ ان کی بہت سی تصانیف جن میں سے ایک کا نام ''وفات النبیؐ'' (۱۱) ہے، صدیوں سے ناپید ہے۔ ان کی واحد کتاب جو زمانے کی دست برد سے بچ گئی، ''المغازی'' ہے۔ ۱۹۶۶ء میں اس کا ایڈٹ کیا ہوا ایڈیشن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن (۱۲) نے عربی زبان سے انگریزی میں منتقل کر کے تین جلدوں میں شائع کیا۔ ۱۹۸۴ء میں اس انگریزی ترجمے کا عربی زبان میں ترجمہ کر کے اسے بیروت (۱۳) (لبنان) سے تین جلدوں میں شائع کیا گیا۔ عربی ترجمے کی تیسری جلد کے صفحہ ۱۱۲۰ پر آپؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں یہ فقرہ ہے:

فتوفی رسول الله ﷺ حین زاغت الشمس یوم الا ثنین لا ثنتی عشره خلت من ربیع الاول ۔	رسول اللہؐ نے پیر کے روز بارہ ربیع الاول کو ''زاغت الشمس'' کے وقت وفات پائی۔

''زاغت الشمس'' دن کی کون سی گھڑی ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت صحیح بخاری میں رسول کریمؐ کے نوجوان ذاتی خادم حضرت انسؓ بن مالک کے الفاظ میں موجود ہے، جس سے معلوم

ہوتا ہے کہ وقت کا حساب لگانے کے یہ الفاظ رسول کریمؐ کی حیات میں رائج تھے۔ صحیح بخاری کی پہلی جلد میں ''کتاب مواقیت صلوۃ'' میں ایک باب ہے جس کا عنوان ''نماز ظہر کا وقت سورج ڈھلتے ہوئے''۔ اس میں حضرت انسؓ بن مالک کے یہ الفاظ درج ہیں:

''**اخبرنی انس بن مالک ان رسول اللّٰہ ﷺ خرج حین زاغت الشمس فصلی الظھر**''۔

اس فقرے کا انگریزی ترجمہ یہ ہے

Narrated Anas bin Malik: Allah's Apostle (PBUH) came out as the sun declined at mid-day, and oHered the Zuhur Prayer. (۱۴)

اس فقرے کا اردو ترجمہ یہ کیا گیا ہے:

''حضرت انس بن مالکؓ نے خبر دی کہ رسول اللہؐ سورج ڈھلے برآمد ہوئے اور ظہر کی نماز پڑھائی''۔ (۱۵)

اس طرح رسول کریمؐ کی وفات کے دوصدی بعد تاریخ میں پہلی بار، واقدی کے قلم سے رسول کریمؐ کی وفات کے بارے میں ایک ایسا مکمل بیان سامنے آیا جس میں وقت وفات، یوم وفات، تاریخ وفات اور ماہ وفات سب ایک ساتھ ایک فقرے میں درج تھے۔ واقدی کا یہ فقرہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کے لشکر کے شام کی طرف کوچ کرنے کے ذکر میں لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے یہ بہت اختصار سے لکھا گیا ہے اور اس ذکر کے بعد کتاب ختم ہوگئی ہے۔ اگر واقدی کی کتاب ''وفات النبیؐ'' موجود ہوتی تو ممکن ہے کہ اس میں پوری تفصیلات درج ہوتیں اور معلوم ہوتا کہ دوصدی بعد یہ روایت کسی طرح واقدی کو ملی۔

یہاں ایک فطری سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر دوسری صدی ہجری کے اواخر میں ۱۲/ربیع الاول (۱۱ھ) کے یوم وفات ہونے کے بارے میں کوئی ایسی مستند روایت موجود تھی، جس کی بنا پر واقدی نے ''مغازی'' میں یہ تاریخ درج کی تو یہ بات ان کے ہم عصر اور اسی شہر مدینہ کے متوطن امام مالکؒ کے علم میں کیوں نہیں آئی؟ اگر امام مالک کے علم میں آئی تو موطا میں کیوں نہیں آئی؟ علاوہ ازیں اس بات سے مدینے میں پیدا ہونے اور رہائش رکھنے والے ابن اسحاق آخری وقت

تک کیسے بے خبر رہے؟ اگر باخبر ہوئے تو جس طرح انہوں نے اسناد دیئے بغیر بارہ ربیع الاول کو آپؐ کی تاریخ ولادت کے طور پر لکھ دیا تھا، اسی طرح اس بار (اور اس بار پوری اسناد کے ساتھ) بارہ ربیع الاول کو آپؐ کی تاریخ وفات کے طور پر کیوں نہیں لکھ دیا؟

مندرجہ بالا سطور میں ''زاغت الشّمس'' کی چودہ سو سال پہلے کی ہوئی توضیح اس مشہور اور مستند ''عربی - انگریزی لغت'' سے مطابقت رکھتی ہے، جو تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ۱۸۶۳ء میں آٹھ جلدوں میں لندن سے شائع ہوئی اور جس کے مولف ایڈورڈ ولیم لین ہیں۔ تیسری جلد میں صفحہ ۱۲۷۷ پر ''زاغت الشّمس'' کے یہ معنی دیئے گئے ہیں:

"The sun declined from the meridian so that the shade turned from one side to the other". (16)

وقت وفات اور وقت ظہر کی قربت کی ایک واقعاتی شہادت یہ ہے کہ احادیث اور تواریخ دونوں میں یہ روایت موجود ہے کہ یوم وفات پیر کو نماز فجر کے دوران میں آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کے دروازے پر لٹکا ہوا پردہ ہٹایا اور دروازے میں کھڑے ہوکر اپنے صحابہؓ کو حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے رہے (۱۷)۔ اس کے بعد اس روز نہ نماز ظہر کا ذکر ملتا ہے اور نہ اس دن نماز ظہر سمیت باقی چار نمازوں میں حضرت ابوبکرؓ کی امامت کا۔

اب تک جن چار اصحاب (امام جعفر صادق، امام مالک، ابن اسحاق، واقدی) کا ذکر ہوا، ان سب کا تعلق مدینے سے تھا اور پہلے دو بزرگ مدینے میں مدفون ہیں۔ پانچویں بزرگ جن کا اب ذکر ہورہا ہے، ان کا تعلق کوفہ سے تھا اور وہ بغداد میں مدفون ہیں، جہاں ابن اسحاق اور واقدی بھی مدفون ہیں، یہ حضرت امام ابوحنیفہؒ ہیں۔ چھٹے بزرگ امام شافعیؒ فلسطین میں پیدا ہوئے اور قاہرہ میں دفن ہیں، ان چھ اصحاب میں صرف واقدی نے آپؐ کی تاریخ وفات لکھی اور دوسری صدی ہجری ختم ہوگئی۔

دوسری صدی ہجری کا اواخر، تیسری صدی ہجری کا آغاز: مشہور مورخ ابن سعد ۱۶۸ھ/۷۸۴ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ ۲۳۰ھ/۸۴۵ء میں بغداد میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہیں۔ ان کا دور حیات دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے آغاز پر محیط ہے، تاہم ان کی

معروف کتاب ''طبقات الکبیر'' تیسری صدی ہجری کے آغاز میں قلم بند ہوئی۔اس کا جدید ایڈیشن پندرہویں صدی ہجری (۱۴۲۱ھ/۲۰۰۱ء) میں قاہرہ سے شائع ہوا ہے۔اس کی پہلی دو جلدیں جنہیں بعض حضرات نے ایک زمانے میں ''کتاب النبیؐ'' کا نام دیا تھا، رسول کریمؐ کے آبا واجداد کے ذکر کے بعد آپؐ کی ولادت سے وفات تک کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہیں۔

طبقات ابن سعد کی دوسری جلد میں ابن سعد نے آپؐ کی تاریخ وفات کے بارے میں چار مختلف راویوں سے منسوب تین روایتیں درج کی ہیں، جو یہ ہیں (۱۸):

۱-حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ ۲۹/صفر (۱۱ھ) بروز بدھ بیمار ہوئے اور۱۲/ ربیع الاول (۱۱ھ) بروز پیر آپؐ کی وفات ہوئی۔

۲-حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات ۱۲/ربیع الاول (۱۱ھ) بروز پیر ہوئی۔

۳-محمد بن قیس سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ ۱۹/صفر ۱۱ھ بروز بدھ بیمار ہوئے۔آپؐ تیرہ راتیں بیمار رہے اور آپؐ کی وفات ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ بروز پیر ہوئی۔(یہ واحد روایت ہے جس میں سنہ وفات کا بھی ذکر ہے)

تاہم ان روایات کو درج کرنے سے بہت پہلے ابن سعد تاریخ وفات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کر چکے تھے:

وهو يموت فتوفى صلى الله عليه	۱۲/ربیع الاول (۱۱ھ) بروز پیر جب آفتاب
صلاة يحبها و يرضا ها حين زاغت	ڈھل چکا تھا، آپؐ کی وفات ہوگئی، اللہ تعالیٰ
الشمس يوم الاثنين لاثنى عشرة ليلة	آپؐ پر ایسی رحمت نازل کرے جس سے آپؐ
خلت من شهر ربيع الاول ـ(۱۹)	خوش ہوں اور جسے آپؐ پسند کریں۔

ابن سعد کے مندرجہ بالا فقرے کا موازنہ واقدی کے فقرے سے کریں:

فتوفى رسول الله ﷺ حين زاغت الشمس يوم الاثنين لاثنتى عشره خلت من ربيع الاول ـ

دوسری صدی ہجری (اور تیسری صدی ہجری کے اوائل) کے مندرجہ بالا مختصر جائزے کا

نچوڑ یہ ہوا کہ تین بزرگ فقہا یعنی امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی نے نہ تو آپؐ کے یوم وفات کا ذکر کیا، نہ ہی تاریخ وفات کا۔ تین بزرگوں یعنی امام مالک، ابن اسحاق اور ابن ہشام نے صرف یوم وفات (پیر) کا ذکر کیا۔ پہلی بار واقدی نے دوسری صدی ہجری میں، آپؐ کے وقت وفات، یوم وفات، تاریخ وفات اور ماہ وفات کا ایک ساتھ ذکر کیا اور واقدی کے کاتب ابن سعد نے جن کی بات واقدی کے مقابلے میں زیادہ معتبر سمجھی جاتی ہے، یہی بات اپنی تاریخ میں دہرائی۔

یہاں دو نکات کا ذکر ضروری ہے۔ اولاً اگر ابن سعد کے مطابق حضرت علیؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ تینوں نے ۱۲/ربیع الاول (۱۱ھ) کی بطور تاریخ وفات روایت کی تو یہ روایت ابن سعد سے پہلے امام مالک نے موطا میں کیوں درج نہیں کی؟ اور ابن سعد کے بعد آنے والے محدثین نے بھی اپنے مجموعہ ہائے حدیث میں کیوں درج نہیں کی؟ ثانیاً امام مالکؒ یا امام بخاریؒ نے یہ روایت لکھی کہ آپؐ نے پیر کو وفات پائی تو اس روایت کو مستند حدیث کا درجہ حاصل ہے، جب کہ واقدی اور ابن سعد کی تحریر (تاریخ وفات: ۱۲/ربیع الاول) کی حیثیت ایک تاریخی روایت کی ہے اور یہ تاریخی روایت نہ ابن اسحاق نے لکھی، نہ ابن ہشام نے۔

تیسری صدی ہجری: اب تیسری صدی ہجری آتی ہے۔ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد تقریباً دو صدیاں گزر چکی تھیں اور آپؐ سے منسوب لاکھوں احادیث عالم اسلام میں گردش کر رہی تھیں اور ایک قول کے مطابق ''مسلمانوں ہی میں نیک دل لوگوں کا ایک طبقہ فضائل کے بارے میں احادیث وضع کرنا نیکی اور عبادت تصور کرتا تھا''۔

امام بخاریؒ جب تقریباً چھ لاکھ احادیث جمع کرنے کے بعد ان میں سے صحیح احادیث کا انتخاب صحیح بخاری کے لیے کرنے بیٹھے تو ایک اندازے کے مطابق ساڑھے سات ہزار احادیث قابل اعتماد پائیں جن میں سے دو تہائی سے زیادہ مکررات کے زمرے میں آتی تھیں۔ مکررات نکال دیں تو صحیح احادیث کی تعداد تقریباً ڈھائی ہزار رہ جاتی ہے، پہلی صدی ہجری میں جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے احادیث جمع کرنے کی سخت حوصلہ شکنی کی اور ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ نے تو اپنے مرض الموت کے دوران میں اپنا عقیدت اور احتیاط سے جمع کیا ہوا مجموعہ

حدیث حضرت عائشہؓ کے سامنے جلا ڈالا (۲۰)، تو ان کے پیش نظر شاید یہی خطرہ ہو جو دوسری صدی ہجری میں کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود تیسری صدی ہجری کے اولین نصف حصے تک تدوین حدیث کا کام جاری رہا، جس کا ثبوت ''مسند ابن حنبل'' ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ ۱۶۴ھ (۷۸۰ء) میں بغداد میں پیدا ہوئے اور ۷۵ سال کی عمر میں ۲۴۱ھ (۸۵۵ء) میں بغداد میں ہی انتقال کر گئے، ان کے مجموعہ حدیث ''مسند ابن حنبل'' میں تقریباً ۳۰ ہزار احادیث ہیں، جن میں جابجا مکررات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں احادیث کو مضامین کے اعتبار سے ترتیب دینے کے بجائے ''سب سے پہلے راوی'' کے عنوان کے تحت ترتیب دیا۔ اس طرح ایک ہی مضمون کی کئی احادیث جن کی روایت مختلف صحابہ سے ہے، پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی (ج ۲) کے مطابق ''مسند (امام حنبلؒ)'' کے متعلق اب غالب رائے یہ ہے کہ اس میں ''صحیح'' احادیث کے ساتھ ساتھ ''غریب'' احادیث بھی موجود ہیں۔ (۲۱)

واضح رہے کہ تیسری صدی ہجری میں جب وہ چھ مجموعہ ہائے حدیث مرتب ہوئے، جنہیں ''صحاح ستہ'' یعنی ''چھ سب سے صحیح مجموعہ ہائے حدیث'' کہا جاتا ہے تو ''چھ'' کی تعداد بڑھا کر نہ تو اس میں ساتویں ''سب سے صحیح مجموعہ حدیث'' کے طور پر ''موطا امام مالک'' کو شامل کیا گیا جو دوسری صدی ہجری میں مدون ہو چکی تھی اور نہ ہی آٹھویں ''سب سے صحیح مجموعہ حدیث'' کے طور پر ''مسند ابن حنبل'' کو شامل کیا گیا جو تیسری صدی ہجری میں ہی ''صحاح ستہ'' سے پہلے شائع ہو چکی تھی۔ خود ''صحاح ستہ'' میں شامل ''سنن ابن ماجہ'' جو ان چھ ''سب سے صحیح'' مجموعہ ہائے حدیث میں سے ایک ہے، اس کی ۴۳۴۱ حدیثوں میں سے ۶۱۳ حدیثیں (یعنی ۱۴%) کمزور قرار دی گئی ہیں اور ۹۹ حدیثیں (یعنی ۲%) ناقابل اعتبار گردانی گئی ہیں۔ (۲۲)

تیسری صدی ہجری میں محدثین کا اصل کام حدیث کی ''تدوین'' نہیں بلکہ ''صحیح'' احادیث کا ''تعین'' تھا۔ ''صحاح'' کا لفظ اسی وجہ سے سامنے آیا، جو آج تک بدستور رائج ہے۔ ''صحاح ستہ'' کے یہ چھ مرتبین صرف بیس سال کے مختصر دور میں یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے۔ کسی کی جائے پیدائش مدینہ، مکہ، بغداد، بصرہ یا قاہرہ نہ تھی جو اس وقت عالم اسلام کے سب سے بڑے علمی

مراکز تھے۔ ان میں سے ایک افغانستان، دو ایران اور تین ترکستان میں پیدا ہوئے۔ ترکستان آج کئی ملکوں میں بٹ چکا ہے۔ ''صحاح ستہ'' اور ان کے مرتبین کے کوائف یہ ہیں:

نام/عرف	مرتب کا معروف نام	جائے پیدائش	ملک	سال پیدائش	سال وفات	عمر
صحیح بخاری	امام بخاری	بخارا	ازبکستان	۱۹۴ھ (۸۱۰ء)	۲۵۶ھ (۸۷۰ء)	۶۰ سال
صحیح مسلم	امام مسلم	نیشاپور	ایران	۲۰۴ھ (۸۲۰ء)	۲۶۱ھ (۸۷۵ء)	۵۵ سال
سنن ابوداؤد	امام ابوداؤد	سجستان	افغانستان	۲۰۲ھ (۸۱۷ء)	۲۷۵ھ (۸۸۹ء)	۷۲ سال
جامع ترمذی	امام محمد بن عیسیٰ ترمذی	ترمِذ	ازبکستان	۲۰۹ھ (۸۲۴ء)	۲۷۹ھ (۸۹۲ء)	۶۸ سال
سنن نسائی	امام احمد بن علی نَسائی	نَسا	ترکمانستان	۲۱۵ھ (۸۳۰ء)	۳۰۳ھ (۹۱۵ء)	۸۵ سال
سنن ابن ماجہ	امام ابن ماجہ	قزوین	ایران	۲۰۵ھ (۸۲۴ء)	۲۷۳ھ (۸۸۷ء)	۶۳ سال

(اکثر کتابوں میں ''نسا'' کو ایران میں اور بعض کتابوں میں ''ترمذ'' کو بھی ایران میں بتایا گیا ہے، جو درست نہیں)

صحاح ستہ میں صحیح بخاری ہر اعتبار سے سرفہرست ہے۔ اسے ''اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتاب'' کا لقب دیا گیا ہے جو اس سے پہلے امام شافعیؒ موطا کے بارے میں کہہ چکے تھے۔ امام بخاریؒ رسول کریمؐ کی وفات کے ۱۸۳ سال بعد پیدا ہوئے۔ اس وقت اموی دور کو بھی بیتے ہوئے ۶۰ سال گزر چکے تھے۔ عباسی سلسلے کا چھٹا خلیفہ امین، جو ہارون الرشید کا بیٹا تھا، خلیفہ تھا۔ جب امام بخاریؒ کا انتقال ہوا تو عباسی خاندان کا پندرہواں خلیفہ معتمد تخت خلافت پر بیٹھا تھا۔ صحیح بخاری سمیت، صحاح ستہ میں کہیں رسول کریمؐ کی تاریخ وفات نظر نہیں آتی۔ ''بخاری'' میں حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے آپؐ کے وقت وفات کا ذکر ملتا ہے۔ موطا میں صرف یوم وفات کا ذکر ہے، سوال یہ ہے کہ تیسری صدی ہجری میں امام بخاری کو وقت وفات کے بارے میں جو روایت پہنچی، وہ دوسری صدی ہجری میں امام مالکؒ کو کیوں نہیں پہنچی جب کہ موطا اور صحیح بخاری دونوں اللہ کی کتاب کے بعد صحیح ترین کتابیں ہیں۔ (ایک سوال یہ بھی ہے کہ موطا کو ''صحاح ستہ'' میں کیوں شامل نہیں کیا گیا)

تیسری صدی ہجری کا ذکر مشہور مورخ ابوجعفر محمد بن جریر طبری پر ختم کرتے ہیں جنہوں نے صحاح ستہ کے تمام مرتبین کے بعد ۳۱۰ھ (۹۲۳ء) میں وفات پائی۔ ان کا سنہ پیدائش ۲۲۵ھ (۸۳۹ء) ہے۔ طبری نے کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک تاریخ لکھی جس کا نام ''تاریخ الرسل والملوک'' ہے۔ یہ ایک جامع تاریخ اور اسلامی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے الفاظ میں اس کا ایک اچھوتا وصف یہ ہے کہ ''طبری نے اپنی فراہم کردہ معلومات کو تاریخی واقعات کے مسلسل بیان کی شکل میں مرتب نہیں کیا، بلکہ یہ دیکھا کہ جو بیانات بھی مل جائیں، خواہ وہ باہم متناقص ہی کیوں نہ ہوں، انہیں اسی شکل میں جس میں وہ ان تک پہنچے تھے لکھ دیا جائے، چنانچہ اسی لیے وہ ان روایات کی صحت کی کوئی ذمہ داری لینے سے گریزاں ہیں، جو انہوں نے جمع کردی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے لوث اور غیر مرتب مجموعہ روایات کی تکرار ہی میں موجود زمانے کی تاریخی تحقیق وجستجو کے سلسلے میں اس تصنیف کی اصل قدر و قیمت مضمر ہے، بالخصوص اس وقت جب اسلام کے ابتدائی زمانے کے واقعات کو از سر نو مرتب کرنے کا سوال در پیش ہو''۔ (۲۳)

رسول کریمؐ کی وفات کی تاریخ کی تاریخی تحقیق وجستجو کے لیے ہمیں اسلام کے بالکل ابتدائی زمانے کے صرف دو مہینوں یعنی ذی الحج ۱۰ھ اور ربیع الاول ۱۱ھ کی تاریخوں کو از سر نو مرتب کا سوال در پیش ہے۔

اس مقصد کے لیے دیکھتے ہیں کہ تاریخ طبری میں ربیع الاول ۱۱ھ کے بارے میں کیا درج ہے؟ تاریخ طبری سے چار متعلقہ اقتباسات یہ ہیں:

۱- ابوجعفر (مراد ابوجعفر محمد بن جریر طبری ہیں) کا قول ہے کہ علمائے تاریخ کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات ربیع الاول میں پیر کو ہوئی، مگر اس ماہ کے کس پیر میں ہوئی، اس میں اختلاف ہے، بعض ارباب سیر نے فقہائے حجاز کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ، پیر کے روز، دو پہر سے قبل، رسول اللہؐ نے وفات پائی۔ (۲۴)

(طبری نے نہ ارباب سیر کے نام لکھے، نہ فقہائے حجاز کے، اس بارے میں ابن سعد نے صرف ایک راوی ''محمد بن قیس'' کا نام لکھا تھا، جو گزشتہ صفحات میں درج ہے)

۲-واقدی کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ۱۲/ربیع الاول پیر کے دن وفات پائی۔ (۲۵)

۳-عبداللہ بن ابی بکر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ۱۲/ربیع الاول پیر کے دن وفات پائی۔ (۲۶)

۴-حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ ۱۲/ربیع الاول ٹھیک اس روز جب آپؐ مدینے میں ہجرت کر کے تشریف لائے، آپؐ نے وفات پائی۔ (۲۷)

طبقات ابن سعد کی تین روایات کی طرح طبری کی تاریخ کے چار مندرجہ بالا اقتباسات میں بھی آپؐ کی تاریخ وفات کے طور پر صرف دو تاریخوں یعنی ۲/ربیع الاول اور ۱۲/ربیع الاول کا ذکر ہے لیکن اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ آپؐ کا انتقال ماہ ربیع الاول ۱۱ھ میں ہوا اور پیر کے روز ہوا، چنانچہ سب سے پہلے یہ تحقیق وجستجو کرنی ہوگی کہ ربیع الاول ۱۱ھ میں پیر کا دن کتنی بار آیا؟ اور کس کس تاریخ کو آیا؟

اس مقصد کے لیے ہمیں کوئی مستند تقویم دیکھنی ہوگی۔ ابوالنصر محمد خالدی کی مرتب کردہ ''ہجری عیسوی تقویم'' (۲۸)، جسے حوالے کی کتاب کے طور پر اکثر استعمال کیا جاتا ہے کے مطابق ماہ ربیع الاول میں پیر کا روز چار بار آیا اور اس دن قمری اور عیسوی مہینوں (اور عیسوی سنہ) کی تاریخیں یہ نکلتی ہیں:

۱-پہلا پیر = ۶/ربیع الاول ۱۱ھ = یکم جون ۶۳۲ء۔

۲-دوسرا پیر = ۱۳/ربیع الاول ۱۱ھ = ۸/جون ۶۳۲ء۔

۳-تیسرا پیر = ۲۰/ربیع الاول ۱۱ھ = ۱۵/جون ۶۳۲ء۔

۴-چوتھا پیر = ۲۷/ربیع الاول ۱۱ھ = ۲۲/جون ۶۳۲ء۔

ابوالنصر محمد خالدی کی تقویم میں، قمری مہینوں کے دنوں کی میکانیکی سی ترتیب یوں رکھی گئی ہے کہ یکم سنہ ہجری سے ۱۵۰۰ سنہ ہجری تک کے پورے پندرہ سو برسوں میں، ماہ محرم کے دنوں کی تعداد ہمیشہ ۳۰، اور اس کے اگلے ماہ صفر کے دنوں کی تعداد ہمیشہ ۲۹ رکھی گئی ہے اور صفر کے بعد ماہ ذی قعدہ تک کے نو مہینوں میں ۳۰ دن اور ۲۹ دن کی یہ ترتیب ہر متبادل مہینے میں جاری رہتی ہے۔ اس طرح پندرہ سو برس تک ماہ رمضان ہمیشہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے، کبھی ۲۹ دن کا نہیں۔

آخری مہینہ ذی الحج میں دنوں کی تعداد ایک سال ۲۹ اور اس کے اگلے سال ۳۰ شمار کی گئی ہے۔ مثلاً ایک سنہ ہجری میں ماہ ذی الحجہ کے دنوں کی تعداد ۲۹ رکھی گئی ہے اور دوسنہ ہجری میں دنوں کی تعداد تیس دکھائی گئی ہے۔ یہ خودساختہ ترتیب بھی ہر متبادل ہجری سال میں ۱۵۰۰ھ تک اسی طرح قائم رکھی گئی ہے۔

قمری تاریخوں کا حساب لگانے کے لیے یہ فارمولا آسان تو ضرور ہے لیکن حقیقت پر مبنی نہیں۔ یہ کوئی سائنسی فارمولا بھی نہیں۔قمری مہینوں کے دن ابوالنصر محمد خالدی کی تقویم کے مطابق نہیں چلتے۔ نہ محرم کا مہینہ ہمیشہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے نہ صفر کا مہینہ سدا ۲۹ روز کا اور نہ رمضان ہمیشہ ۳۰ دن کا ہوتا ہے۔عام مشاہدے کی بات ہے کہ بعض اوقات دو دو مہینہ لگا تار ۲۹، ۲۹ دن یا ۳۰، ۳۰ دن کے بھی ہوتے ہیں، بلکہ بات اس سے بڑھ کر ہے۔

فروری ۱۹۶۹ء میں بیسویں صدی کے مشہور عالم اور اسلامی مورخ ڈاکٹر حمید اللہ کا ایک مضمون (۲۹) لندن کے ماہوار انگریزی جریدے ''اسلامک ریویو'' میں شائع ہوا۔انہوں نے لکھا کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض اوقات لگا تار تین ماہ تک قمری مہینے ۲۹، ۲۹ دن کے ہوتے ہیں (۳۰)، انہوں نے مزید لکھا کہ ماہرین فلکیات کے مطابق متواتر چار ماہ تک قمری مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے بھی ہوئے ہیں (۳۱)، آخری بات کے ثبوت کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۱ء میں پاکستان کی سرکاری رویت ہلال کمیٹی کے مطابق چار متواتر قمری مہینے یعنی صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی اور جمادی الاول ۳۰، ۳۰ دن کے ہوئے۔اس آسمانی حقیقت کو زمینی حقیقت تسلیم کرنے کے بعد اس کا تعین کس طرح ہوگا کہ چودہ سو سال پہلے، ایک مخصوص مہینے میں کس قمری مہینے کی کس تاریخ کو کیا دن تھا؟

ہجری اور عیسوی سنین کی تاریخوں میں مطابقت پیدا کرنے والی کوئی معیاری تقویم یہ تو قطعی طور پر بتا سکتی ہے کہ ''عیسوی'' تقویم کے مطابق کسی سال کے کسی ماہ کی کسی تاریخ کو کیا دن ہوگا لیکن تا حال دنیا کی کوئی تقویم کسی دن کے بارے میں قطعی طور پر یہ نہیں بتا سکتی کہ اس روز ''قمری'' مہینے کی کیا تاریخ تھی۔کسی موجودہ تقویم کے مطابق نکالی ہوئی قمری تاریخ میں ایک دو دن آگے پیچھے ہو جانا معمولی بات ہے اور تین چار دن آگے پیچھے ہو جانا بھی غیر معمولی بات نہیں۔

اگر چودہ صدیاں گزرنے کے بعد ہمارے پاس تقویم کے علاوہ یہ معلوم کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ ہوتا کہ ربیع الاول ۱۱ھ کے دوسرے پیر کو ربیع الاول ۱۱ھ کی کیا تاریخ تھی (جو تقویم کے مطابق ۱۳/ربیع الاول نکلتی ہے) تو پھر یہ کہنے کا جواز بنتا تھا کہ جب پہلی صدی ہجری میں بھی روایتاً ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ کا بطور تاریخ وفات ذکر ہوا، جو تاریخ طبری میں درج ہے اور دوسری صدی ہجری میں مشہور مورخ واقدی نے اسے مغازی میں باضابطہ تحریر بھی کر دیا اور ابن سعد نے اسے دہرا بھی دیا، جو طبقات ابن سعد میں موجود ہے تو ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ کا بطور تاریخ وفات مضبوط جواز بنتا ہے۔

اس صورت میں واقدی کی تحریر پر یہ اعتراض تو ہوسکتا تھا کہ یہ تاریخ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بہت بعد کیوں معلوم اور بیان ہوئی اور نیز یہ کہ دوسروں نے اس سے پہلے کیوں بیان نہیں کی لیکن بارہ ربیع الاول ۱۱ھ کے مقابلے میں تاریخ وفات کے طور پر کوئی اور تاریخ، مضبوط استدلال کے ساتھ پیش نہیں کی جاسکتی تھی کیونکہ کوئی ایسی تاریخ ضبط تحریر میں نہیں آئی تھی۔

واقدی کا انتقال ۲۰۷ھ/۸۲۲ء میں ہوا۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد اور آج سے نو صدی پہلے اسپین میں پیدا ہونے والے مشہور اسلامی مورخ عبدالرحمٰن سہیلی اندلسی (۵۰۸ھ-۵۸۱ھ/ ۱۱۱۴ء-۱۱۸۵ء) نے واقدی کی روایت کی رد میں ایک تاریخی شہادت مدلل انداز میں پیش کی۔ درمیان کی صدیاں چھوڑ کر ہم چودہویں صدی ہجری/بیسویں صدی عیسوی پر آتے ہیں جب برصغیر پاک و ہند کے دو مشہور سیرت نگاروں اور مورخین یعنی سید سلیمان ندویؒ اور ڈاکٹر حمید اللہؒ نے سہیلی کا نام لے کر سہیلی کے ''موقف'' کی تائید کی، جس کی تردید یا مدلل انداز میں اختلاف رائے ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ ''موقف'' کیا ہے؟ یہ مدلل انداز کیا ہے؟ یہ ذیل میں درج ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے فروری ۱۹۶۹ء کے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ آٹھ صدی پہلے، عظیم مورخ سہیلی نے زور دے کر لکھا ہے کہ اس بارے میں ''عملی طور پر اتفاق'' ہے کہ رسول کریمؐ نے حج وداع کے موقع پر ۱۰ھ میں میدان عرفات میں جو دن گزارا، وہ جمعہ کا روز تھا اور ذی الحج تھا۔ اس صورت میں ذی الحج ۱۰ھ، محرم ۱۱ھ اور صفر ۱۱ھ میں سے کسی بھی ماہ میں خواہ دنوں کی

تعداد ۲۹ ہو یا ۳۰، اور دنوں کی اس تعداد کو خواہ کسی طرح ترتیب دیا جائے پیر کے روز کسی طرح ۱۲/ربیع الاول نہیں ہوسکتا۔ اکیسویں صدی کے قاری کے لیے یہ بات واضح کرنے کے لیے ہم نے ایک تاریخ وار ضمیمہ منسلک کردیا ہے، جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اگر تینوں مہینے ۳۰، ۳۰ دن کے ہوں تو بارہ ربیع الاول کو اتوار ہوگا۔ اگر کوئی سے دو مہینے ۳۰ دن کے اور ایک مہینہ ۲۹ دن کا ہو تو بارہ ربیع الاول ایک دن پہلے آئے گا اور اس روز ہفتے کا دن ہوگا۔ اگر کوئی سا ایک مہینہ ۳۰ دن کا اور دو مہینے ۲۹ دن کے ہوں تو بارہ ربیع الاول مزید ایک دن پہلے جمعہ کو ہوگا۔ اگر تینوں مہینے متواتر ۲۹ دن کے ہوں تو بارہ ربیع الاول کو جمعرات ہوگی۔ اس طرح یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اگر نو ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ تھا تو پیر کے روز کسی طرح ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ نہیں ہوسکتا۔ ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ جمعرات سے اتوار تک کسی روز ہوگا۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے محولہ بالا مضمون میں مزید لکھا ہے کہ دو صورتوں میں سے صرف ایک ممکن ہے: یا ۹ ذی الحج ۱۰ھ کو جمعہ نہیں تھا اور یا ۱۲/ربیع الاول کو پیر نہیں تھا۔ (آج تک سارا زور موخر الذکر متبادل پر رہا ہے)

یہی بات سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبیؐ (ج ۲) کے حاشیے میں ان الفاظ میں لکھی ہے:

''سب سے پہلے امام مذکور (سہیلی) ہی نے درایتاً اس نکتہ کو دریافت کیا تھا کہ بارہ ربیع الاول ۱۱ھ کی روایت قطعاً ناقبل تسلیم ہے کیوں کہ دو باتیں یقینی طور پر ثابت ہیں۔ روز وفات دوشنبہ (پیر) کا دن تھا، اس سے تقریباً تین مہینے پہلے ذی الحجہ ۱۰ھ کی نویں تاریخ کو جمعہ کا دن تھا۔ (صحاح قصہ حجۃ الوداع، صحیح بخاری تفسیر ''الیوم اکملت لکم دینکم''۔ (۳۲)

یہ لکھنے کے بعد سید سلیمان ندوی نے اپنی تحریر میں جو بعض مقامات پر گنجلک اور ایک جگہ درست نہیں ہے اور جسے اکیسویں صدی عیسوی کے قاری کو خود پڑھنا، سمجھنا اور اس پر فیصلہ کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے وہ ہماری مندرجہ بالا رائے پر انحصار نہ کرے، اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ ''وفات نبوی کی صحیح تاریخ ہمارے نزدیک یکم ربیع الاول ۱۱ھ ہے''۔ (۳۳)

اس کے برعکس ڈاکٹر حمید اللہ نے فروری ۱۹۶۹ء کے اپنے مقالے میں جو علامہ شبلی کے ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کے بعد شائع شدہ سیرت النبیؐ کی جلد اول کی اشاعت اول (۱۹۱۸ء)

کے تقریباً نصف صدی بعد شائع ہوا، یکم ربیع الاول ۱۱ھ کا سرسری سا ذکر کرنے کے بعد یکم ربیع الاول ۱۱ھ کو یکسر نظرانداز کر کے ۲/ربیع الاول ۱۱ھ کی بطور تاریخ وفات روایت کو معتبر ترین قرار دیا ہے اور یہی بات اپنی انگریزی کتاب ''محمد رسول اللہ'' میں بھی لکھی۔(۳۴)

علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی اور دوسرے سیرت نگار اپنی رائے کی تائید میں قدیم راویوں کی روایات کا حوالہ دیتے رہے ہیں، جب کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے ۲/ربیع الاول ۱۱ھ کی تائید میں کسی راوی کا نام دینے کے بجائے اپنا وہ نوترتیب کیلینڈر پیش کیا ہے جس کی رو سے آپؐ کی تاریخ وفات صرف ۲/ربیع الاول ۱۱ھ ہی ہوسکتی ہے، تاہم انہوں نے خود اپنے اس کیلینڈر کو عارضی قرار دیا اور آخری فیصلہ مستقبل کے ماہر فلکیات پر چھوڑا ہے۔ (باقی)

حواشی اور حوالہ جات

(۱) سیرۃ النبیؐ، ج ۲، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی (اضافہ وتکملہ)، ص ۱۷۰، مطبع معارف، اعظم گڈھ، بھارت، ۱۹۳۳ء/ایضاً، ص ۱۷۶، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء۔(۲) The Life of Muhammad، ابن اسحاق، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۶۷ء۔(عربی سے انگریزی ترجمہ، الفرڈ گیوم، پہلی بار لندن سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی)۔(۳) رحمۃ للعالمینؐ، ج ۱، قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، ص ۴۳، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۱ء۔(۴) The Life of Muhammad،(۵) صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرۃؓ (عربی متن اور ترجمہ) تحقیق وترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ، بیکن بکس، میاں چیمبرز، ۳ ٹمپل روڈ، لاہور ۲۰۰۷ء/ بیکن بکس، گل گشت کالونی، ملتان۔(۶) ۱-موطا (عربی متن اور اردو ترجمہ) مرتب امام مالک ابن انسؒ، مترجم علامہ وحید الزماں، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی، ۲-Al-Muwatta (انگریزی ترجمہ)، مترجم Aisha Abdul-Rahman Bewley، Kagan Laul International London WC1B 3,5W, U.K۔(۷) موطا (عربی متن اور اردو ترجمہ) مترتب امام مالک ابن انسؒ، مترجم علامہ وحید الزماں، میر محمد کتب خانہ، آرام باغ، کراچی۔(۸) ۱- The Translation of the Meanings of Sahih Al-Bukhari (Vol:5)، مرتب امام بخاریؒ، ص ۵۰۹ تا ۵۳۰، مترجم: ڈاکٹر محسن خان، اسلامک یونیورسٹی مدینہ قاضی پبلی کیشنز، ۱۲۱ ذوالقرنین چیمبر کنپت روڈ، لاہور۔۲- صحیح بخاری شریف مترجم (ج ۲)، مترجم علامہ

وحیدالزماں،ص ۷۵۹ تا ۷۷۱،مکتبہ رحمانیہ،اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۹ء۔ ۳- صحیح البخاری (عربی متن بمعہ اردو ترجمہ، ج۲) مترجم ظہور الباری اعظمی، ۸۰۱ تا ۸۱۴، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۱۹۸۵ء۔(۹) ۱-موطا (عربی متن اور اردو ترجمہ) نمبر شمار ۶ (۱) پر درج ہے، ص ۲۲۰ تا ۲۳۵، نمبر شمار ۶ (۱) پر درج ہے ۔۲- Al-Muwatta (انگریزی ترجمہ) نمبر شمار ۶ (۲) پر درج ہے۔۸۵ تا ۹۲، نمبر شمار ۶ (۲) پر درج ہے ۱۹۸۹ء۔ (۱۰) ۱-موطا (عربی متن اور اردو ترجمہ) نمبر شمار ۶ (۱) پر درج ہے، ص ۶۰۷، نمبر شمار ۶ (۱) پر درج ہے ۔۲- Al-Muwatta (انگریزی ترجمہ) نمبر شمار ۶ (۲) پر درج ہے۔ ۳۷۷، نمبر شمار ۶ (۲) پر درج ہے ۱۹۸۹ء۔ (۱۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۲۲، زیر اہتمام پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۵۸۶، شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، بار دویم ۲۰۱۰ء۔ (۱۲) The Kitab Al-Maghazi of Al-Waqidi، محمد بن عمر بن واقدی، تحقیق ڈاکٹر مارسڈن جونز، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، لندن، ۱۹۶۶ء۔ (۱۳) المغازی (انگریزی سے عربی میں ترجمہ)، ج ۳، محمد بن عمر بن واقدی، تحقیق ڈاکٹر مارسڈن جونز، ص ۱۱۲۰، عالم الکتب، بیروت لبنان، ۱۹۸۴ء۔ (۱۴) The Translation of the Meanings of Sahih Al-Bukhari (Vol:1)، نمبر شمار ۸ (۱) پر درج ہے، ص ۳۰۵، نمبر شمار ۸ (۱) پر درج ہے، ۱۹۷۶ء۔ (۱۵) صحیح بخاری شریف مترجم، ج ۱، نمبر شمار ۸ (۲) پر درج ہے، ص ۳۰۴، نمبر شمار ۸ (۲) پر درج ہے، ۱۹۹۹ء۔ (۱۶) Arabic-English Lexicon (Part:3)، ایڈورڈ ولیم لین، ص ۱۲۷۷، ولیمز اینڈ نور گیٹ، ہنریٹا سٹریٹ کوونٹ گارڈن، لندن، ۱۸۶۳ء۔ (۱۷) Translation of the Meanings of Sahih Al-Bukhari (Vol:1)، نمبر شمار ۸ (۱) پر درج ہے، ص ۳۶۶ ''کتاب الاذان'' باب ''اہل العلم والفضل احق بالامامۃ'' حدیث نمبر ۶۴۸، ۱۹۷۶ء۔ (۱۸) ۱-الطبقات الکبیر (عربی میں) ج ۲، محمد بن سعد، تحقیق ڈاکٹر علی محمد عمر، ص ۲۳۴ تا ۲۳۵، مکتبۃ الخانجی، الشرکہ الدولیہ للطباعۃ، منطقہ صناعیہ ثانیہ، قطعہ ۱۳۹، شارع ۳۹، مدینہ ۶/اکتوبر، قاہرہ، pic@6oct.ie-eg.com، ۲۰۰۱ء۔ ۲- طبقات ابن سعد (اردو ترجمہ) حصہ دوم، محمد بن سعد، مترجم علامہ عبداللہ العمادی، ص ۳۱۷، نفیس اکیڈمی، سٹریچن روڈ، کراچی، ۱۹۸۲ء۔ (۱۹) ۱- الطبقات الکبیر (عربی میں) ج ۲، نمبر شمار ۱۸ (۱) پر درج ہے، ص ۱۷۱، نمبر شمار ۱۸ (۱) پر درج ہے، ۲۰۰۱ء۔ ۲- طبقات ابن سعد (اردو ترجمہ)، حصہ اول، نمبر شمار ۱۸ (۲) پر درج ہے، ص ۲۷۴، نمبر شمار ۱۸ (۲) پر درج ہے، اشاعت سویم ۱۹۸۳ء۔ (۲۰) تذکرۃ الحفاظ (ترجمہ) ج ۱، امام شمس الدین ذہبی، مترجم شیخ الحدیث حافظ محمد اسحاق، ص ۲۹، اسلامک پبلشنگ ہاؤس، شیش محل روڈ، لاہور،

۱۹۸۱ء۔(۲۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲، نمبر شمار ۱۱ پر درج ہے، ص ۰ ۷، نمبر شمار ۱۱ پر درج ہے، ۱۹۶۶ء۔ (۲۲) اٹلس سیرت نبویؐ (عربی سے اردو ترجمہ)، ڈاکٹر شوقی ابو خلیل، مترجم شیخ الحدیث حافظ محمد امین، ص ۴۸۶، ۱- مکتبہ دار السلام ریاض سعودی عرب ۲۰۰۳ء و مکتبہ دار السلام، لوئر مال، لاہور۔(۲۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۲، نمبر شمار ۱۱ پر درج ہے، ص ۴۰۵، نمبر شمار ۱۱ پر درج ہے، ۲۰۰۵ء۔(۲۴) تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) ج ۲، حصہ اول، اردو ترجمہ، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، مترجم سید محمد ابراہیم ندوی، ص ۴۳۸- ۴۳۹، دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی، ۲۰۰۳ء۔(۲۵) ایضاً، ص ۴۳۹۔(۲۶) ایضاً، ص ۴۵۰۔(۲۷) ایضاً، ص ۴۴۹۔(۲۸) تقویم ہجری وعیسوی، ابوالنصر محمد خالدی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۴ء۔(۲۹) The Islamic Review (February 1969)، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مضمون کا عنوان "The "Nasj، The Islamic Review 18, Eccleston Square London, S.W.J. England، ۱۹۶۹ء۔ (۳۰) ایضاً، ص ۹۔(۳۱) ایضاً۔(۳۲) سیرت النبیؐ ج ۲، نمبر شمار ۱ (۲) پر درج ہے، ص ۱۷۷ (حاشیہ)، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء۔(۳۳) ایضاً، ص ۱۷۸ (حاشیہ)۔(۳۴) ۱- The Islamic Review (February 1969)، نمبر شمار ۲۹ پر درج ہے، ۱۹۶۹ء۔۲- محمد رسول اللہؐ (انگریزی میں) (اردو ترجمہ) ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مترجم پروفیسر خالد پرویز، ص ۳۱۳، بیکن بکس، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، بیکن بکس، گل گشت کالونی، ملتان، ۲۰۰۹ء۔

الواقدی وکتابہ المغازی، منہجہ ومصادرہ کا ناقدانہ جائزہ

کلیم صفات اصلاحی

واقدی کی کتاب المغازی سیرت ابن اسحاق کے بعد سیرت کا سب سے قدیم ترین ماخذ ہے، تاہم کبار محدثین امام بخاری، امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور فن نقد کے ائمہ امام یحییٰ بن معین اور دار قطنی وغیرہ نے واقدی کی تضعیف کی ہے، یعقوب بن شیبہ، ابراہیم الحربی، محمد بن اسحاق الصغانی اور مسیبی وغیرہ اس کو مستند اور ثقہ تسلیم کرتے ہیں۔ ہندوستانی علماء کا ایک طبقہ واقدی کو فن سیر کا امام اور ان کی روایات کو معتبر و مستند سمجھتا ہے لیکن علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی بے احتیاطی اور مراسیل میں بے جا اضافہ کے سبب واقدی کی ثقاہت کے قائل نہیں اور صرف انہیں روایتوں کو تسلیم کرتے ہیں جن کی متابعت و استناد دوسری مستند احادیث و روایات سیرت سے ثابت ہو یا جن کی تائید دوسرے معتبر محققین کے یہاں موجود ہو۔

پیش نظر کتاب الواقدی و کتابہ المغازی، منہجہ و مصادرہ (۲ جلد)، ڈاکٹر عبدالعزیز بن سلیمان ناصر السلومی کا تحقیقی مقالہ ہے ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۴ء میں سعودی عرب کی وزارت تعلیم نے اس کو شائع کیا ہے، واقدی کی شخصیت، اسلوب تحقیق اور مصادر پر یہ ایک محققانہ اور ناقدانہ مطالعہ ہے، جس سے مصنف کی گہری نظر اور علم رجال پر وسیع مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ واقدی کے سوانح، علمی ماحول، فکری نشو ونما، شیوخ و تلامذہ، علمی مرتبہ، اخلاق و کردار، اسفار، مخالفین و موافقین، تشیع، عہدۂ قضا اور پھر کتاب المغازی کی اہمیت، سرقہ کا الزام، اسلوب، واقدی کی ترجیحات، علمی اضافے، مرویات اور تفسیری، لغوی اور جغرافی مواد وغیرہ پر مصنف کی دقت نظر، دقیقہ سنجی اور ژرف نگاہی کی وجہ سے یہ کتاب واقدی کے مطالعہ میں واقعی گراں قدر اضافہ کہلانے کی مستحق ہے۔

کتاب۲ جلدوں میں ہے پہلی جلد ۵۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، ڈاکٹر صالح بن عبداللہ العبوی کا دو صفحے کا پیش لفظ ہے۔ پھر مصنف نے ۹ صفحات کے مقدمہ میں موضوع کے انتخاب کے اسباب، علم مغازی و سیر کی اہمیت، متقدمین علمائے سیرت ابان بن عثمان، عروہ بن زبیر اور امام زہری وغیرہ اور دوسری صدی ہجری کے محمد ابن اسحاق اور واقدی کا مختصراً ذکر کیا ہے، پوری کتاب تین ابواب اور سات فصلوں میں ہے۔

پہلا باب: پہلے باب کی پہلی فصل میں واقدی کے نام و نسب، کنیت، لقب، ولادت، نشو و نما، خاندان، اخلاق و عادات مشہور اساتذہ و تلامذہ اور علمی اسفار کے متعلق علمائے سیر و انساب و رجال کے اقوال کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

سنۂ پیدائش: واقدی کے سنہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ نے ۱۳۰ھ، ۱۲۰ھ اور ۱۲۹ھ کے اختلاف سنین میں مصنف کے نزدیک ۱۲۹ھ کی روایت زیادہ صحیح ہے (ص۲۴)۔ جائے پیدائش مدینہ منورہ ہے۔ (ص۲۵)

اخلاق و عادات: مصنف نے واقدی کی تین اخلاقی خوبیوں فیاضی، ایثار اور حیا کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ واقدی اپنے لیے کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے، قاضی تھے لیکن وفات کے وقت کفن کے لیے کپڑے نہیں تھے، خلیفہ مامون نے کفن کا انتظام کیا (ص۳۳)، ہمیشہ خود پر دوسروں کو ترجیح دیتے تھے۔ (ص۳۴)

اساتذہ: واقدی کے اساتذہ میں ابن ابی ذئب (ثقہ)، ابوبکر بن ابی سبرہ (عالم) ابومعشر نجیح، اسامہ بن زید لیسی (صدوق)، افلح بن حمید بن نافع انصاری (ثقہ)، ثور بن یزید (ثقہ، ثبت)، ربیعہ بن عثمان التیمی (ثقہ حافظ، فقیہ، عابد، امام حجہ) ضحاک بن عثمان بن عبداللہ الحزامی (صدوق)، عبدالحمید بن جعفر بن عبداللہ انصاری (صدوق رمی بالقدر) عبدالرحمٰن بن عمرو بن ابی عمر والاوزاعی (فقیہ ثقہ جلیل)، عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج، فلیح بن سلیمان بن ابی المغیرہ الخزاعی (صدوق کثیر الخطا)، کثیر بن زید السلمی، معمر بن راشد، مالک بن انس، محمد بن عبداللہ بن اخی الزہری، محمد بن عجلان المدنی، ہشام بن الغاز بن ربیعۃ القرشی (ثقہ) کے اسمائے گرامی ہیں۔ (ص۳۶-۳۸)

تلامذہ: ابوبکر الصغانی (ثقہ ثبت)، ابوبکر بن ابی شیبہ (ثقہ حافظ)، ابوعبید القاسم بن سلام

(ثقہ، فاضل)، احمد بن الخلیل البرجلانی (صدوق)، احمد بن الولید الفحام (ثقہ)، احمد بن عبید بن ناصح، احمد بن منصور رمادی، حارث بن ابی اسامہ، حسن بن عثمان زیادی، سلیمان بن داؤد الشاذ کونی، محمد بن الفرج الازرق، محمد بن سعد بن منیع ہاشمی، محمد بن شجاع الثلجی، محمد بن یحییٰ ازدی وغیرہ کے نام ہیں۔ (ص ۳۹-۴۰)

اسفار: اسفار علمی، واقدی کے سوانح کا اہم حصہ ہیں۔ مواد سیرت کی تحقیق کے لیے انہوں نے مدینہ سے مکہ، مریسیع، حنین، عراق، کوفہ، رقہ، بغداد، موصل، سیلحین، دمشق، حمص کا سفر کیا (ص ۴۱-۴۵)۔ مریسیع اور جہاں جہاں بھی عہد نبوی میں جنگیں ہوئیں واقدی نے وہاں جا کر ان کا بذات خود معائنہ کیا (ص ۴۱)۔ واقدی نے بیس برس کی عمر میں ۱۵۰ھ میں عراق کا سفر کیا تھا، امام ابوحنیفہ کا انتقال ہوا تو وہ کوفہ میں تھے اور ان سے ملاقات کرنے والے تھے کہ امام صاحب کی وفات کی خبر ملی، مصنف لکھتے ہیں کہ اس سے واقدی کے طلب علم اور مشاہیر کبار سے بچپن میں ہی ملاقات کی تڑپ کا اندازہ ہوتا ہے۔ (ص ۴۲)

فصل ثانی: یہ واقدی کی علمی زندگی اور وفات سے متعلق ہے، جس میں ان کی علمی طلب، مقام و مرتبہ، حدیث، فقہ و تفسیر وغیرہ سے واقفیت، ان کی تصنیفات اور ان پر تعلیقات، علمائے جرح و تعدیل کے اقوال اور آخر میں دونوں اقوال کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ تشیع کا الزام، عہدۂ قضا اور وفات یہ جلی عنوانات ہیں۔

عہد واقدی کا علمی ماحول: اس ذیل میں مصنف نے مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ، واسط اور بغداد کے علمی ماحول کا جائزہ اس مقصد سے لیا ہے تا کہ ان علاقوں میں فن قرأت، حدیث، فقہ، مغازی، سیر، انساب، لغت اور شعر کی صورت حال کا اندازہ ہو جائے، جیسے مدینہ کے قراء عبیداللہ بن عمر بن حفص العدوی، نافع بن ابی نعیم، فقہاء میں محمد بن عجلان، عبداللہ بن یزید، ابن ابی ذئب وغیرہ اور ائمہ سیر وانساب و شعر میں محمد بن اسحاق، ابومعشر نجیح اور عبداللہ بن جعفر وغیرہ نے مدینہ کی علمی مجلسوں کو پرنور کر رکھا تھا (ص ۵۱-۵۲)، بصرہ، کوفہ، واسط اور بغداد کے ان علماء کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے جنہوں نے قرأت، حدیث، فقہ، لغت اور اخبار وانساب کی مجلسوں کو آراستہ کر رکھا تھا (ص ۴۹-۶۵)۔ بصرہ میں عقبہ بن غزوان، بریدہ بن الحصیب، عمران بن الحصین، ابوعمرو بن

العلاء التمیمی، علی بن حمزہ الکسائی، خالد بن مہران، سلیمان بن طرخان، عثمان البتی، عثمان السری، زفر بن الہذیل، روبۃ العجاج، عبداللہ بن المقفع اور کوفہ میں سعد بن ابی وقاص، عمر بن یاسر، عبد اللہ بن سعد، خباب بن الارت، ابوموسیٰ اشعری، سلمان فارسی، سلیمان بن مہران، ابان بن تغلب، یحییٰ بن یمان العجلی، اسماعیل بن ابی خالد، سفیان ثوری، یونس بن اسحاق، عبداللہ بن شبرمہ، ابوحنیفہ، داؤد الطائی، محمد بن السائب کلبی وغیرہ اور واسط میں ایوب ابوالعلاء، عوام بن حوشب ربعی، خالد بن عبداللہ، اسحاق ازرق اور بغداد میں ہشام بن عروہ بن زبیر، ہیثم بن بشیر الواسطی، اسماعیل بن زکریا وغیرہ کا ذکر ہے۔

قوت حافظہ: واقدی کی قوت حفظ کے متعلق علمائے رجال کے متعدد اقوال نقل کیے گئے ہیں۔ خطیب بغدادی نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں نے جن لوگوں سے روایت کی ان میں واقدی سے بڑھ کر قوت حفظ کسی کی نہیں تھی، ذہبی نے مجاہد کے اس قول پر صاد کرتے ہوئے مزید کہا کہ فن اخبار وسیر بھی ان ہی کی ذات پر ختم ہوگیا۔ **قلت صدق کان الی حفظه المنتهى فى الاخبار والسير** (ص ۶۷)۔ صاحب تذکرۃ الحفاظ لکھتے ہیں: **محمد بن عمر واقدی ...... الحافظ البحر** ۔(ص ۶۷)

وسعت علم: عبداللہ بن المبارک کا قول ہے ''ہم نے واقدی کے سمندر سے موتی حاصل کیے، ذہبی نے ان کو احد اوعیۃ العلم، ابن حماد حنبلی نے علامہ، احد اوعیۃ العلم، وکیع نے المتسعین فی العلم سے خطاب کیا ہے، ابن حجر واقدی کو متروک کہتے ہیں لیکن ان کے وسعت علم کے بہرحال معترف ہیں اور خطیب کے مطابق امام احمد بن حنبل واقدی کی کتابوں کو اکثر و بیشتر مطالعہ میں رکھتے تھے۔ (ص ۶۸-۶۹) **کان اکثر نظره فى كتب الواقدى** ۔

واقدی کا مرتبہ اور مرجوعیت: عبداللہ بن المبارک کا قول ہے کہ میں مدینہ جاتا تو واقدی کے علاوہ کوئی مجھے فائدہ نہیں پہنچاتا تھا، واقدی سے میری علمی تشنگی بھی بجھتی تھی اور وہ دوسرے شیوخ کی نشاندہی بھی کرتے تھے، دراوردی سے کسی نے واقدی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا تم مجھ سے واقدی کے متعلق پوچھتے ہو؟ میرے بارے میں واقدی سے پوچھنا، **تسألنى عن الواقدى سل الواقدى عنى** ۔(ص ۶۹) واقدی کے استاذ ابن ابی ذئب کو جب کسی حدیث

میں شک ہوتا تو وہ واقدی سے رجوع کرتے۔(ص ۷۱) امام مالک نے بھی جادوگرنی کے قتل کی روایت کے متعلق واقدی سے رجوع کیا تھا۔(ص ۷۱)

واقدی کا اعتراف: مصنف نے اہم کتب مراجع و مصادر سے واقدی کے متعلق علمائے سیر و رجال کے توصیفی اقوال نقل کیے ہیں، محمد بن سلام الجمحی کا قول ہے: محمد بن عمر اپنے زمانے کے بڑے عالم تھے، ابراہیم الحربی کا قول ہے مسلمانوں پر سب سے زیادہ احسان واقدی کا ہے۔ ابوبکر صغانی فرماتے ہیں کہ واقدی کی فضیلت کی دلیل یہ ہے کہ ان کی مجلس میں شاذکونی جیسے محدثین شرکت کرتے تھے، موسیٰ بن ہارون بیان کرتے ہیں کہ بخدا میں نے علم و فضل میں واقدی جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں دیکھا، ابن خلکان نے ان کو عالم، امام اور صاحب اللباب نے بھی امام عالم اور صاحب تصانیف کثیرہ لکھا ہے اور ابن کثیر نے ان کو **فانــه مـن ائـمة هـذا الشـان الکبار** کے الفاظ سے یاد کیا۔(ص ۷۲-۷۳)

علم حدیث: مغازی، تاریخ، سیر اور انساب میں درک و مہارت کے علاوہ مصنف نے واقدی کی محدثانہ شان کے متعلق لکھا کہ انہوں نے مالک بن انس، سفیان ثوری، افلح بن حمید، ثور بن یزید وغیرہ جیسے ائمہ حدیث سے حدیثیں روایت کی ہیں لیکن وہ متروک ہیں۔ خطیب نے مختلف فیہ احادیث سے واقدی کی اچھی واقفیت کی جانب اشارہ کیا ہے۔**قـد اشـار الخطیب الـی عـلـم الواقدی باختلاف الناس فی الحدیث** (ص ۷۷) اور عبداللہ ابن مبارک، ابوبکر صغانی، دراوردی وغیرہ کے اقوال سے علم حدیث میں واقدی کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

علم فقہ: واقدی نے فقہ کی تحصیل امام مالک بن انس، ابن ابی ذئب اور امام اوزاعی وغیرہ سے کی، ابراہیم صرفی کہتے ہیں کہ امام مالک اور ابن ابی ذئب کے مسائل فقیہ کا جو ذخیرہ واقدی کے پاس ہے وہ سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے، اس کی تصدیق کی ضرورت نہیں۔

ابن سعد کا قول ہے کہ واقدی کو مغازی کے علاوہ حدیث و احکام میں ائمہ کے اختلافات اور متفق علیہ مسائل کا علم تھا، **کـان عـالما بالمغازی ...... باختلاف الناس فی الحدیث و الاحـکـام و اجتـماعهم علی ما اجتمعوا علیه**۔(ص ۷۹) کسی نے ابراہیم الحربی سے کہا کہ ہم امام مالک کے مسائل فقہ قلم بند کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا واقدی کے مسائل فقہ لکھو

اس لیے کہ دنیا میں ایک ہی (واقدی) ہیں جو کہتے ہیں کہ میں نے ثوری، ابن ابی ذئب اور یعقوب سے مسائل فقہ دریافت کیے تھے۔ **سال بعض اهل العلم ابراهیم الحربی فقال ارید ان اکتب مسائل مالک ...... فقال اکتب مسائل الواقدی ، فی الدنیا احد یقول سالت الثوری وابن ابی ذئب و یعقوب** (ص۷۹)۔ یاقوت لکھتے ہیں کہ واقدی امام مالک اور سفیان ثوری کے فقہی آراء سے اچھی طرح واقف تھے۔ **کان عارفا برای مالک و سفیان الثوری** (ص۸۰)۔ ابراہیم حربی لکھتے ہیں کہ وہ فقہ کے بڑے امام تھے گرچہ انہوں نے اجتہادی غلطیاں بھی کی ہیں۔ **هو امام کبیر وان اخطأ فی اجتهاده** ۔(ص۸۰)

علم تفسیر وقرأت: واقدی نے علم تفسیر وقرأت حبر القرآن نافع بن ابی نعیم سے حاصل کیا تھا، ذہبی فرماتے ہیں واقدی نے نافع بن ابی نعیم اور عیسیٰ بن وردان سے قرأت کی روایت کی ہے (ص۸۰) ابن ندیم نے لکھا ہے کہ واقدی نے ذکر القرآن اور کتاب الترغیب فی علم القرآن وغلط الرجال کے نام سے کتاب تالیف کی (ص۸۱)۔ نیز انہوں نے کتاب المغازی میں سورۃ الانفال کی تفسیر میں اپنے شیخ ابن جریج سے روایت کی ہے۔ (ص۸۱)

تصنیفات: واقدی کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، چنانچہ جب اس نے بغداد کے مغربی حصہ سے مشرقی جانب سفر کیا تو اس کے پاس کتابوں سے بھری ہوئی چھ سو گٹھریاں تھیں، ہر گٹھری دو آدمی اٹھاتے تھے اور دو غلام (نوکر) شب و روز کتابت کرتے تھے۔ وفات سے قبل دو ہزار دینار کی کتابیں فروخت کی گئیں (ص۸۳)۔ واقدی کی کل کتابوں کی تعداد ۳۳ بتائی ہے (ص۸۶)۔ جیسے کتاب التاریخ والمغازی والمبعث ، کتاب اخبار مکہ، کتاب الطبقات، کتاب فتوح الشام، کتاب فتوح العراق، کتاب الجمل ، کتاب مقتل الحسین، کتاب السیر ۃ، کتاب ازواج النبیؐ، کتاب الردوالدار، کتاب حرب الاوس والخزرج، کتاب صفین ، کتاب وفاۃ النبیؐ، کتاب امر الحبشۃ والفیل، کتاب المناکح ، کتاب السقیفہ وبیعۃ ابی بکرہ، کتاب ذکر القرآن، کتاب سیرۃ ابی بکر ووفاتہ، مداعی قریش والانصار فی القطایع ووضع عمر الدواوین وتصنیف القبائل ومراتبہا وانسابہا، کتاب الترغیب فی علم القرآن وغلط الرجال، کتاب مولد الحسن والحسین ومقتل الحسین، کتاب ضرب الدنانیر والدراہم، کتاب تاریخ الفقہاء، کتاب الآداب، کتاب التاریخ الکبیر، کتاب غلط

الحدیث، کتاب السنۃ والجماعۃ وذم الھوی وترک الخوارج فی الفتن ۔ کتاب الاختلاف ۔ (یہ کتاب شفعہ وصدقہ کے سلسلہ میں فقہائے مدینہ وکوفہ کے درمیان اختلافات کے احاطہ پر مشتمل ہے)

کتاب تفسیر القرآن ، ثعالبی نے استفادہ کیا تھا، یہ برطانوی میوزیم میں موجود ہے، کتاب فی طعام النبیؐ کا ذکر ابن سعد نے کیا ہے، ایک کتاب جس کا موضوع ولادت نبویؐ ہے، دمشق کے مکتبہ ظاہریہ میں موجود ہے، اسلامی غزوات وفتوح پر مشتمل بعض دوسری کتابیں فتوح الشام، فتوح مصر، فتوح آرمینیہ، بلاد ماوراء النہرین، فتوح البہنساء (فی صعید مصر)، فتوح افریقیا، فتوح العجم والعراق، فتوح الاسلام ببلاد العجم وخراسان ہیں جن کا ذکر بروکلمان نے کیا ہے۔

فواد سیزگین نے اس فہرست میں کتاب الشوری درفتوح آمد، فتوح الجزیرہ والخابور و دیاربکر فی العراق کا اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں اس کا ذکر کیا ہے اوراس کا اقتباس بھی نقل کیا ہے۔ (ص ۸۷)

کتابوں کے ناموں میں اختلاف: تصنیفات واقدی کے ناموں کی نقل میں اختلافات کا مصنف نے خاص طور سے ذکر کیا ہے اور اپنی ترجیحات بھی دی ہیں۔ مثلاً ابن ندیم نے واقدی کی کتاب المغازی کا نام ''کتاب التاریخ والمغازی والمبعث تحریر کیا ہے، یاقوت نے اس کا نام کتاب التاریخ والمغازی والبعث'' لکھا ہے، مصنف کے نزدیک اول الذکر نام صحیح اور موخرالذکر تصحیف ہے (ص ۸۴)۔ معجم الادباء میں ''کتاب الجمل'' کو کتاب یوم الجمل ہے، کتاب ذکر القرآن کا نام صفدی نے ''ذکرالاذان'' اور کتاب الترغیب فی علم القرآن وغلط الرجال'' کو ''الترغیب فی علم المغازی وغلط الرجال'' لکھا ہے۔ مصنف کی نظر میں یہ غلطیاں کاتبوں کی تصحیف وتحریف کا نتیجہ ہیں (ص ۸۵)۔ پھر تصنیفات واقدی پر تعلیقات کے عنوان سے محققانہ بحث کی ہے۔ بخوف طوالت اس کی تفصیلات قلم انداز کی جاتی ہیں۔ (ص ۸۷-۱۰۶)

وہ محدثین جنھوں نے واقدی کی تعدیل کی: مشہور محدث ابوبکر الصغانی نے واقدی کے علم وفضل خصوصاً واقفیت حدیث کی تحسین کرتے ہوئے کہا، ان سے روایت کرنے میں کوئی انقباض نہیں (ص ۱۰۷)۔ عمر الناقد نے دراوردی سے واقدی کے متعلق پوچھا تو انہوں نے کہا ''وہ امیر المومنین فی الحدیث'' ہیں (ص ۱۰۷)۔ مصعب الزبیری نے کہا، واقدی جیسا صاحب علم

ہماری نظر میں کوئی اور نہیں (ص ۱۰۸)، ابراہیم حربی کا بیان ہے کہ واقدی کے متعلق مصعب زبیری سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا وہ ثقہ، مامون ہیں۔ عیسی، ابو یحییٰ، یزید بن ہارون، عبید القاسم وغیرہ جیسے اکابر علم حدیث نے بھی واقدی کو ثقہ لکھا ہے۔ (ص ۱۰۸-۱۰۹)

خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ یحییٰ بن معین سے واقدی اور ابی البختری کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے علم حدیث میں واقدی کو زیادہ بہتر بتایا۔ **ان یحییٰ بن معین سئل عن الواقدی و البختری فقال الواقدی اجودهما حدیثا** ۔ (ص ۱۰۹)

واقدی پر جرح: مصنف نے واقدی پر ان کبار محدثین اور علمائے رجال کی تنقیدی آرا اور اصولی لحاظ سے کی جانے والی گرفتوں کو نقل کرتے ہوئے جمع الاسانید، تقلیب احادیث، ترکیب احادیث (یعنی بعض حدیثوں کو دوسری احادیث میں جوڑنے کے عمل) اور بغیر نقد کے احادیث کو نقل کرنے کے واقدی کے طریقہ پر بحث کی ہے اور کبار محدثین جیسے امام احمد، امام شافعی، یحییٰ بن معین، امام نسائی، امام بخاری، امام مسلم، بیہقی، ذہبی، ابن حجر، سخاوی وغیرہ کے تنقیدی اقوال نقل کیے ہیں اور پھر ان گرفتوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔

پہلی گرفت یہ ہے کہ واقدی تمام سندوں کو ایک ساتھ مختلف حدیثوں کو ایک ہی متن میں پیش کرتے تھے۔ اس طریقہ پر نقد کرتے ہوئے امام احمد فرماتے ہیں، واقدی پر کوئی نکیر نہیں سوا اس کے کہ وہ مختلف سندوں کو ایک جگہ، ایک ہی متن میں بغیر سیاق کی نشاندہی کیے ہوئے لکھ جاتے ہیں۔ **لیس انکر علیه شیئا الا جمعه الاسا نید و مجیئه بمتن واحد علی سیاقة واحدة عن جماعة وربما اختلفوا** ۔ (ص ۱۱۰-۱۱۱)

عبداللہ بن احمد کو یقین تھا کہ واقدی حدیثوں میں الٹ پھیر کرتے ہیں (۱۱۱)، ابوداؤد فرماتے ہیں کہ میں واقدی کی حدیث نہیں لکھتا کیونکہ وہ حدیثوں میں الٹ پھیر کرتے ہیں، داؤد بن اشعث کے نزدیک واقدی کی کتابوں میں تقلیب احادیث کا معاملہ بالکل واضح ہے، فتح یمن اور خبر عنسی کی احادیث زہری سے روایت کی ہیں حالانکہ زہری سے یہ حدیثیں مروی نہیں ہیں۔ (ص ۱۱۲)

اس کے علاوہ ترکیب احادیث اور بغیر پرکھے حدیثوں کو نقل کر دینے کے طریقہ پر ابن مدینی، امام احمد اور ذہبی وغیرہ کے اقوال نقل کیے گئے ہیں، علی بن مدینی کہتے ہیں کہ "ابراہیم بن ابی

یحییٰ جھوٹے ہیں لیکن واقدی نے ان سے روایت کی (۱۱۴) اور یہ کہ واقدی کے یہاں بیس ہزار حدیثیں ایسی ہیں جن کا سماع ثابت نہیں"، **عند الواقدی عشرون الف حدیث لم یسمع بھا** ۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ **الواقدی لیس بشئی** ۔ امام شافعی کہتے ہیں واقدی کی کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں (ص ۱۱۵)، بندار بن بشار کہتے ہیں واقدی سے زیادہ جھوٹا میں نے نہیں دیکھا (۱۱۶)، ابن نمیر کہتے ہیں میں واقدی سے حدیث بیان کرنا پسند نہیں کرتا (ص ۱۱۶)، نسائی ان کو متروک الحدیث کہتے ہیں اور اسحاق بن راہویہ وضع حدیث کا بیان کرتے ہیں، **کان عندی ممن یضع** (ص ۱۱۶)، ابوزرعہ نے واقدی کو ضعفا میں شمار کیا ہے (۱۱۶)، دارقطنی فرماتے ہیں واقدی مختلف فیہ اور ان کی حدیث میں ضعف واضح ہے (ص ۱۱۷)، بیہقی کا کہنا ہے واقدی قابل حجت نہیں (ص ۱۱۷)، ذہبی نے متعدد اقوال نقل کیے ہیں جن سے واقدی کا ضعف ظاہر ہے، ابن حجر نے بھی واقدی کو غیر معتبر، نا قابل حجت قرار دیا ہے **متروک فی الحدیث** جیسے الفاظ سے یاد کیا ہے (ص ۱۱۸)، امام نووی سے ابن حجر نے نقل کیا کہ "**الواقدی ضعیف باتفاقھم**، امام سخاوی نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے۔ (۱۱۹)

مصنف کی تحقیق: محدثین نے واقدی کے طریقہ کار پر جو گرفتیں کی ہیں، مصنف نے مختصراً لیکن محققانہ جواب دینے کی کوشش کی ہے اور سب سے پہلے جمع اسانید کے متعلق لکھا ہے کہ ہمارے خیال میں دوران درس واقدی کا انداز یہی تھا اور اس میں واقدی منفرد نہیں ہیں، بعض اور اہل علم نے بھی اس اسلوب کو اپنایا ہے، یہ قول ابراہیم الحربی یہ کوئی عیب نہیں زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہی کیا ہے (ص ۱۲۱)، **لیس ھذا عیبا قد فعل ھذا الزھری وابن اسحاق** ۔ اس طریقہ کار سے واقدی کا مقصد طلبہ کے سامنے اختصار تھا، الگ الگ سندوں کی تفصیل سے طلبہ گھبرا جاتے تھے، چنانچہ بعض طلبہ نے جب دوران درس سوال کیا تو واقدی نے کہا کہ ہر حدیث کی تمام سندوں کے الگ الگ بیان کرنے میں طوالت ہے۔ (ص ۱۲۲)

بعض نتائج بحث: اس پوری بحث سے مصنف نے چند نتائج اخذ کیے ہیں:

۱- واقدی حدیث میں ضعیف ہیں، کیوں کہ اکثر محدثین نے ان پر کلام کیا ہے، ۲-تاریخ وسیر کی روایات میں ان کا خاص منہج ہے جو ائمہ حدیث سے مختلف ہے، ۳- ان کے

نزدیک کسی مجہول شخص سے بھی روایت کی جاسکتی ہے اگر چہ ائمہ حدیث اس کو صحیح نہیں مانتے (۱۳۱)،۴-واقدی پر وضع حدیث کا الزام درست نہیں جیسا کہ امام ذہبی کا قول ہے ''لا اتھمہ بالوضع ''ابن کثیر نے ان کو صدق سے متصف گردانا ہے،۵-جمع اسانید میں واقدی منفرد نہیں ہیں، امام زہری اور ابن اسحاق کے یہاں بھی یہ اسلوب موجود ہے (ص ۱۳۲)، واقدی فن سیر کے امام ہیں، جس میں ان سے بے نیازی نہیں برتی جاسکتی، محققین سیرت نگاروں نے ان کو معتبر تسلیم کیا ہے اور حدیث میں ان کے ضعف کے باوجود فن سیر میں ان کو معتبر لکھا۔ اما فی اخبار الناس والسیرۃ و الفقه وسائر الفنون فھو ثقة باجماع ۔(ص ۱۳۴)

واقدی کا تشیع: مصنف نے واقدی سے تشیع کا الزام رفع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کے نظریات کے حامل تھے، علمائے جرح وتعدیل میں ابن ندیم کے علاوہ کسی نے ان کے عقیدہ پر کہیں طعن نہیں کیا ہے۔ البتہ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ وہ مذہباً شیعہ تھے اور تقیہ بھی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حضرت علیؑ آنحضورؐ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہیں، جس طرح حضرت موسیٰؑ کے لیے ان کا عصا اور حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کے لیے احیاء موتیٰ (ص ۱۳۵) لیکن مصنف نے ابن ندیم کے اس قول کو محل نظر بتا کر اس کے عدم صحت کے متعدد دلائل دیے ہیں۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ ابن ندیم چونکہ خود رافضی اور معتزلی تھے، لہٰذا اپنے مسلک کو فروغ دینے کی ان کی باتیں قبول نہ ہوں گی اور روافض کی یہ روایت بھی رہی ہے کہ وہ تعداد میں اضافہ کے مقصد سے بعض مشاہیر کی جانب اپنے مذہب کو منسوب کردیتے تھے (ص ۱۳۵)، ابن ندیم اس رائے میں تنہا ہے کیوں کہ خود شیعوں میں واقدی کا شیعہ ہونا ثابت نہیں ہے، یہ ممکن نہیں کہ واقدی شیعہ ہو اور شیعی تذکروں میں اس کا اظہار واہتمام نہ ہو، صاحب اعیان الشیعہ نے ضرور شیعہ لکھا ہے مگر اس کا ماخذ بھی ابن ندیم ہے۔ (ص ۱۳۶)، مستشرق مارسیڈن نے کہا کہ چونکہ واقدی کی دو کتابیں مولد الحسن والحسین ومقتل الحسین کے نام سے ملتی ہیں، اس لیے لوگوں نے اس کو شیعہ باور کیا ہو (ص ۱۳۶) یا اس کی بعض مرویات ایسے شیوخ سے ہیں جن کا رجحان تشیع کی جانب تھا۔ مثلاً عبدالسلام بن موسیٰ بن جبیر، ہشام بن سعد المدنی، ابوبکر بن عبداللہ محمد بن سبرہ وغیرہ، ممکن ہے اس بنیاد پر واقدی کو بعض لوگوں نے شیعہ سمجھ لیا ہو، مصنف نے واقدی کے عدم

شیعیت پر کل سات دلیلیں دے کر ثابت کیا ہے کہ واقدی شیعہ نہیں تھا۔

عہدۂ قضا: مصنف کے مطابق خلیفہ ہارون الرشید اور واقدی کے مابین اس وقت تعلقات ہوئے جب وہ اپنی خلافت کے ایک سال پر حج کو گیا، وزیر یحییٰ بن خالد برمکی بھی ساتھ تھا، مدینہ میں ہارون رشید کو ایسے شخص کی تلاش ہوئی جو آثار مدینہ سے واقف ہو، واقدی کی طرف لوگوں نے نشان دہی کی اور انہوں نے خلیفہ کو معالم مدینہ سے واقف کرایا، جب واقدی ۱۸۰ھ میں بغداد گئے تو ہارون رشید نے ان کو مشرقی بغداد کا قاضی بنایا، ۲۰۴ھ میں مامون نے واقدی کو عسکر المہدی کا قاضی بنایا (ص ۱۵۵)۔ وہ وفات (۲۰۷ھ) تک اس عہدہ پر فائز رہے، (ص ۱۵۷)، محمد بن سماعۃ التمیمی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (ص ۱۵۵)

واقدی کا حفظ قرآن: خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ واقدی حفظ قرآن کی سعادت سے محروم تھے، **من سعة علمه و كثرة حفظه لا يحفظ القرآن**، ایک مرتبہ مامون نے خواہش ظاہر کی کہ وہ نماز جمعہ پڑھائیں، واقدی نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے سورۂ جمعہ یاد نہیں، مامون نے کہا میں آپ کو یاد کرادوں گا لیکن باوجود کوشش کے واقدی پوری سورہ یاد نہ کر سکے، علی بن صالح نے بھی یاد کرانے کی ناکام کوشش کی، ایک اور قصے میں مفصل بن حسان کا بیان ہے کہ ''میں نے واقدی کے پیچھے نماز جمعہ پڑھی تو اس نے **ان هـذا لفي الصحف الاولى** کے بعد **صحف عيسى و موسى** پڑھا''۔ (ص ۱۵۸)

مصنف نے اس روایت کی عدم صحت کے متعدد دلائل دیے ہیں کہ یہ روایت مرسل ہے، راویوں میں رافعی کذاب اور احمد بن کامل اور البربری ضعیف ہیں، بربری واقدی کی وفات کے سات سال بعد پیدا ہوا، پھر یہ اس عام اعتراف کے برخلاف ہے جو واقدی کی قوت حفظ کا شاہد ہے، سورہ جمعہ کے نہ یاد کر سکنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کو دوسری سورتیں یاد نہیں تھیں، بالفرض یہ روایت صحیح بھی ہے تو یہ واقدی کے بڑھاپے کی بات ہے جب ذہن اتنا تیز نہیں رہ جاتا۔ (ص ۱۵۹)

وفات: واقدی کے سنۂ وفات کے متعلق مصنف نے تین اقوال تحریر کیے ہیں کہ سنہ انتقال ۲۰۶ھ ہے اور یہ کتانی اور ابن عساکر کا قول ہے، ابن سعد ۲۰۷ھ اور خطیب بغدادی ۲۰۹ھ لکھتے ہیں۔ مصنف کی نظر میں ۲۰۷ھ زیادہ صحیح ہے۔ (ص ۱۶۳)

باب ثانی: یہ کتاب المغازی کے منہج ومصادر سے متعلق ہے، اس میں کل تین فصلیں ہیں۔

کتاب المغازی کی واقدی کی جانب نسبت: واقدی سے اس کتاب کی نسبت کے متعدد دلائل دیے گئے ہیں:

۱-خطیب بغدادی اور امام ذہبی نے لکھا کہ واقدی مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں مغازی کا درس دیتے تھے۔۲-خطیب بغدادی، ابن ندیم اور یاقوت حموی وغیرہ نے واقدی کی تصنیفات میں کتاب التاریخ والمغازی والمبعث کا ذکر کیا ہے۔۳-اس کتاب کی بنیاد پر ابن عساکر اور ذہبی وغیرہ نے واقدی کو ''صاحب المغازی'' لکھا ہے۔۴-محققین نے اس سے خصوصی اعتنا کیا اور مرویات پر اعتماد بھی کیا، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''منتقی من مغازی الواقدی'' کے نام سے اس کی تلخیص کی (ص ۱۷۰)۔۵-فتح الباری میں اکثر ''کتاب المغازی للواقدی'' کی مرویات شامل ہیں، (ملاحظہ ص ۱۷۰)۔۶-امام ابن تیمیہؒ نے منہاج السنہ میں بطور دلیل بعض مرویات واقدی نقل کی ہیں۔(ص ۱۷۲)

مصادر سیرت اور کتاب المغازی کی اہمیت: مصنف کے بقول اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کتاب المغازی کا شمار سیرت نبوی کے بنیادی مصادر میں ہوتا ہے اور مولف اس مقام ومرتبہ پر فائز ہیں کہ ان سے بے نیازی واستغنا ممکن نہیں، سیرت ابن اسحاق کے بعد سب سے اہم ماخذ یہی کتاب المغازی ہے، واقدی نے ہر غزوہ وسریہ کے زمانۂ وقوع کی تعیین انتہائی دقت نظر سے کی ہے (ص ۱۷۴)، ان مقامات کے سنین کی نشان دہی بھی کی جہاں جنگیں ہوئیں، ان راستوں کا تعین بھی کیا جن کو غزوات کے دوران رسول اللہؐ نے استعمال کیا تھا، واقدی کے اضافات کو ابن کثیر نے اضافات حسنہ سے تعبیر کیا ہے، ایسا مواد بھی خاصا ہے جس میں محدثین کے طریقۂ سند کو اپنایا گیا ہے۔ان امتیازات سے مغازی سیرت کا اہم اور بنیادی مصدر ہے۔(ص ۱۷۵)

واقدی پر سرقہ کا الزام اور مصنف کا دفاع: جوزیف ہورووٹز (Josef Horovitz) نے اپنی کتاب المغازی الاولی ومولفوہا میں واقدی کے تذکرہ میں لکھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ واقدی نے ابن اسحاق کی سیرت سے استفادہ کیا **و لا یمکن الشک فی ان الواقدی استخدم کتاب اسحاق** (ص ۱۷۶) بلکہ حق یہ ہے کہ متقدمین میں سب سے زیادہ مواد اسی سے اخذ کیا،

مگر اس نے ابن اسحاق کا نام بار بار لینے سے اس لیے احتراز کیا کہ ابن اسحاق سے استفادہ عار نہ بن جائے ''**غیرهم قد حدثني ایضاً**'' خود اس غیرت کا فسانہ بیان کرتا ہے۔(۱۷۶)

ہوروٹز کے مذکورہ خیالات، استشراقی منہج کی اصل مثال ہیں، مصنف نے رد میں کہا کہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔ **ان هوروفتس ...... لم یقدم دلیلا واحدا علی دعواه** (ص ۱۷۷)۔ اسی طرح کتاب المغازی میں اس نے لفظ ''**قالوا**'' سے یہ خیال کیا کہ استفادہ تو اس لفظ سے ظاہر ہے۔ مگر نام نہ لینا بددیانتی کی جانب اشارہ کرنا ہے، مصنف نے دفاع میں کہا کہ لفظ **قالوا** واقدی نے اکثر ان جگہوں پر استعمال کیا ہے جہاں تمام سندوں کو ایک جگہ لکھا ہے (ص ۱۷۷) جو لوگ واقدی کے اس طریقہ تالیف و تحقیق سے واقف ہیں انہیں اندازہ ہے کہ یہ واقدی کا انداز ہے، یہ سرقہ ہے نہ بددیانتی۔

سیرت ابن اسحاق اور کتاب المغازی میں جملوں کی مماثلت کی بنیاد پر واقدی پر کیے جانے والے اعتراض اور سرقہ کے الزام کی یہ بنیاد بھی مصنف کے نزدیک غیر مستحکم ہے، بنیادی مصادر و مآخذ میں جملوں کا ایک جیسا ہونا محققین کے نزدیک متہم نہیں ہے، محدثین کے یہاں بھی اکثر جملے یہاں تک کہ الفاظ تک ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن کسی نے اس کو سرقہ سے تعبیر نہیں کیا، مصنف نے چند سرایا سے متعلق ابن اسحاق اور واقدی کی بعض روایتوں کا باہم موازنہ کر کے (ص ۱۸۱-۱۸۴) ثابت کیا کہ واقدی پر سرقہ کا الزام بے بنیاد ہے۔

فصل ثانی: فصل ثانی واقدی کے اسلوب سے متعلق ہے، اس میں سات بحثیں ہیں۔ کتاب کا مضمون، اسناد جمعی کا استعمال، علمی مواد کی تنظیم اور پیش کش، وقایع اور جنگوں کی تاریخ کا تعین وغیرہ، قرآن اور اشعار عرب سے استشہاد، علاقائی مطالعہ کی اہمیت، شریک جنگ افراد سے روایت، شیوخ سے مذاکرہ، اختلافی مسائل میں موقف کی تحدید اور کتاب المغازی کے علمی اضافے۔

مصنف نے کتاب المغازی کے تمام مباحث کے خلاصہ کے بعد لکھا ہے کہ واقدی نے تمام غزوات و سرایائے نبوی کی تفصیل کی ہے (ص ۱۸۹) اور اسناد جمعی کے اصول کے مطابق ۲۵ شیوخ کا ذکر کیا ہے (ایضاً)، جنگوں کے نام زمانی ترتیب کے لحاظ سے تحریر کیے ہیں اور سپہ سالاروں کے نام اور میدان جنگ کا ذکر بھی کیا ہے (ایضاً) اور غزوۂ موتہ سے متعلق اسامہ بن زید کی حدیث

پراس کتاب کا خاتمہ ہے۔(ص۱۹۲)

واقدی کا اسلوب: مصنف کا خیال ہے کہ کتاب المغازی کی بیشتر روایات محدثین کے طریقہ کے مطابق الگ الگ سندوں کے لحاظ سے ہیں اور کہیں کہیں اسناد جمعی یعنی لفظ "قالوا" سے آغاز ہے، واقدی نے صرف ۳۵ جگہوں پر اس اصول سے کام لیا ہے (ص۱۹۳) **وقد ذکر الواقدی ھذا الاسناد الجمعی فی کتابہ المغازی فی (۳۵) موضعات۔**

مصنف نے لکھا کہ واقدی نے مغازی کی ترتیب میں بیدار مغزی اور سلیقہ مند منصوبہ بندی سے عمل کیا ہے، وہ پہلے ایک جگہ سندیں لکھ دیتے ہیں پھر لفظ (قالوا) کے ذریعہ ان کو سمیٹ دیتے ہیں اور اسی سند سے متعدد مختلف واقعات کا تذکرہ کرتے جاتے ہیں، کبھی واقعہ اسناد جمعی کے ساتھ لکھا، پھر دوسرے متعدد طرق سے روایتوں کا اضافہ کر دیا، غزوۂ بدر و احد اور خندق وغیرہ کی روایتوں میں ان کا یہی انداز ہے۔ کبھی شیوخ کے ناموں کی صراحت کے بغیر لفظ قالوا سے روایت شروع کر دی (ص۲۰۱-۲۰۲)، آخر میں لکھا کہ واقدی کا اکثر مواد محدثین کے طریقوں کے مطابق ہے، **قد ساق اکثر مادتہ العلمیہ بالاسناد الفردی علی طریقۃ المحدثین۔** (ص۲۰۵)

(غزوات) کی تاریخوں کا تعین: مصنف کے مطابق واقدی نے جنگوں کے مہینوں، سالوں حتیٰ کہ دنوں کی تعیین و تحدید کا اہتمام کیا ہے اور بہت کم ایسا ہوا ہے کہ محض سال کے تعین پر اکتفا کیا گیا ہو، **لقد اھتم الواقدی فی تحدید تاریخ الغزوات والسرایا التی ذکرھا فی کتابہ المغازی تحدیدا دقیقا بالشھر والسنۃ غالبا احیانا بالیوم والشھر والسنۃ** (ص۲۰۶)، اس خوبی کا اعتراف ابن کثیر نے بھی کیا ہے، **وصف ابن کثیر الواقدی بان عندہ تاریخا محررا** (ص۲۰۷) اور لکھا ہے کہ حوادث کی تاریخوں کے ضبط و تعین میں واقدی کو اپنے پیش رووں پر فوقیت ہے اور ان کے یہاں تاریخوں کے ضبط کا مکمل اہتمام ہے (ص۲۰۷)، مصنف نے واقدی اور ابن اسحاق کی نقل کردہ تاریخ غزوات و سرایا کا ایک جدول بنا کر دونوں کے موازنہ سے کئی نتائج نکالے ہیں، سیرۃ کے ان دونوں مصادر میں حوادث اور بڑے غزوات کی تاریخوں میں اتفاق ہے، کم ایسا ہوا کہ متاخرین اہل سیر نے ان

دونوں سے اختلاف کیا ہولیکن مصنف نے تقریباً ایسے ۲۵ واقعات کی نشان دہی کی ہے، جن کی متعین تاریخ صرف واقدی نے کی ہے ۔ (ص ۲۰۹) ، اس لحاظ سے واقدی کوابن اسحاق پر فوقیت حاصل ہے،بعض حوادث وسرایا جن کا ذکرابن اسحاق نےنہیں کیا ہے واقدی کے یہاں ان کا ذکر ہے ۔مثلاً سریہ محمد بن مسلمہ،سریہ ابی بکراور سریہ عمرو بن العاص وغیرہ کا ذکرابن اسحاق میں نہیں ملتا ہے (ص ۲۰۹) ، یہیں سے واقدی کے متعلق ابن کثیر کی اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ واقدی کے یہاں اضافات حسنہ بھی ملتے ہیں ۔(ص۲۰۹)

بعض غزوات کی تاریخوں کا تعین: حضرت حمزہ کورسول اللہؐ نے سیف البحر کی جانب بھیجا تھا،ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجرت کے دوسرے سال کا واقعہ ہے لیکن یہ کس مہینہ کا واقعہ ہے میں اس کے تعین سے ناواقف ہیں، **لم اقف علی تحدیدھا بالشھر** (ص۲۱۰)،واقدی نے لکھا ہے کہ یہ ہجرت کے ساتویں مہینہ یعنی ماہ رمضان کا واقعہ ہے، **فی شھر رمضان علی راس سبعة اشھر من مھاجرہ** (ص۲۱۰)،سریہ سالم بن عمیر ہجرت کے۱۲ویں مہینہ کے آغاز شوال میں بھیجا گیا (واقدی)،ابن اسحاق نے سریہ کی تفصیلات دی ہیں لیکن تاریخ کی تعیین نہیں کی (ص۲۱۲)،غزوۂ بنی قینقاع واقدی کی تحقیق کے مطابق بروز سنیچر ہجرت کے بیسویں مہینہ شوال کے نصف ثانی میں ہوا (ص۲۱۲)،ابن اسحاق نے کوئی تعیین نہیں کی ،ان کے شاگرد ابن ہشام نے مدت محاصر ۱۵دن لکھا ہے مگر مہینہ اور دن کی تعیین انہوں نے بھی نہیں کی ہے (ص۲۱۲)،مصنف کا بیان ہے کہ ابن سعد،طبری اورابن کثیر وغیرہ نے واقدی کی روایت تسلیم کی ہے،(ص۲۱۲)،واقدی کے مطابق ہجرت کے چھٹے سال ربیع الآخر کے مہینہ میں آپؐ نے سریہ محمد بن سلمہ ذوالقصہ کی جانب بھیجا تھا۔(۲۲۴)ابن اسحاق کواس سریہ کا کچھ علم نہیں(**لم اقف علی ذکر لھذہ السریة عندہ** ،ص۲۲۴) جبکہ ابن سعداورابن سیدالناس نے اس کا ذکراپنی کتابوں میں واقدی کےحوالہ سے کیا ہے۔(ص۲۲۴)

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ واقدی کے یہاں غزوات وسرایا کی تاریخوں کے تعین کوخاص اہمیت دی گئی ہےاور متاخرنے واقدی کی روایات کوتسلیم کیا،الدوری کا بیان ہے کہ واقدی واقعات کے تاریخی تعین میں ابن اسحاق سے زیادہ تحقیق سے کام لیتے ہیں۔(ص۲۴۶)

پہلے اجمال پھر تفصیل: واقدی پہلے اجمال پھر تفصیل کے اسلوب پر عمل پیرا ہیں، **لقد سلک الواقدی فی کتابه المغازی طریقة الاجمال ثم التفصیل** (ص ۲۴۶) شروع میں اپنے مصادر و مآخذ پھر غزوات و سرایا کی تفصیلات (ص ۲۴۶)، متعدد جگہوں پر واقدی نے اسی اصول پر عمل کیا۔

واقدی کے اسی طرز تصنیف پر ناقدین کو اعتراض ہے کہ اصول روایت کے لحاظ سے یہ طریقہ غلط ہے، محققین سیرت ہر روایت کے آغاز سے سندوں کی تفصیل تحریر کرتے ہیں لیکن واقدی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے اس واقعہ کو اپنے کس شیخ سے سنا، کس سے کہا اور عینی شاہد کون ہے، پھر نفس واقعہ اور تفصیلات میں واقدی کے بیانات کی تصدیق معاصر روایتوں سے بہت کم ہو پاتی ہے۔

قرآنی آیات سے استدلال: تاریخی واقعات وحوادث کی تفصیل میں واقدی نے حسب ضرورت قرآن کی آیتوں سے استشہاد کیا ہے، اگر کسی غزوہ کے لیے کوئی آیت اتری ہے تو اس کو ضرور نقل کیا ہے مثلاً سریہ نخلہ کے ذکر میں "**یسئلونک عن الشهر الحرام**" اور جنگ بدر کے ذیل میں سورۃ الانفال کی آیتوں کی مختصر تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ آیتیں جنگ بدر کے موقع میں نازل ہوئیں **و ذکر بعض الآیات التی ذکر انها نزلت فی شان بدر** (ص ۲۵۰)، اس کے علاوہ دوسرے غزوات میں بھی اس کی مثالیں ہیں۔

اشعار سے استشہاد: غزوات و سرایا میں جہاں جہاں واقدی نے اشعار کو بطور استشہاد پیش کیا ہے مصنف نے ان کا احاطہ کر کے لکھا ہے کہ واقدی نے اشعار میں اعتدال سے کام لیا ہے اور پوری کتاب میں کل ۱۲۹۷ اشعار نقل کیے ہیں، (ص ۲۵۳)، ابن اسحاق نے صرف "**ما قیل من الشعر فی یوم بدر**" کے تحت ۱۳۹۳ اشعار لکھے ہیں۔ (ص ۲۵۳)

واقدی کا جغرافیائی مطالعہ: مصنف نے لکھا ہے کہ واقدی کو جنگوں اور حوادث کے جائے وقوع کے سلسلہ میں معلومات اکٹھا کرنے کا بچپن ہی سے شوق تھا، یہی وجہ ہے کہ واقدی کے اس اہتمام وشوق نے ان کو مدینہ منورہ کے نقوش اور وہاں آنحضورؐ اور صحابہ کرامؓ کے آثار کے عالم کی حیثیت سے شہرت عطا کی۔ **حتی عرف بذلک و اشتهر امره عند الخاص والعام**

(ص ۲۵۵)، ہارون رشید کی رہنمائی اوپر گزر چکی ہے بقول واقدی "فلم ادع موضعا من المواضع ولا مشهدا من المشاهد الامررت بهما" (ص ۲۵۶)، وہ صرف دارالہجرۃ یعنی مدینہ کے علاقوں سے ہی نہیں۔ عہد نبوی میں جہاں بھی جنگیں ہوئیں ان تمام علاقوں سے واقفیت تھے، اس کے لیے ابنائے صحابہ وابنائے شہدا اوران کے غلاموں تک سے رجوع کیا کہ "هل سمعت احدا من اهلك يخبرك عن مشهده واين قتل"؟ کیا آپ نے اپنے لوگوں میں سے کسی سے سنا جو آپ کو ان کی جائے شہادت کی نشان دہی کرے (ص ۲۵۶) جب ان کو پتہ لگتا تو وہ اس جگہ کے معاینہ کے لیے جاتے، مریسیع اسی لیے گئے، بلکہ کوئی غزوہ ایسا نہیں جہاں جا کر انہوں نے اس کی معلومات نہ حاصل کیے ہوں (۲۵۱)، ہارون القروی کا بیان ہے کہ "میں نے واقدی کو مکہ میں ایک چمڑے کے تھیلہ کے ساتھ دیکھا، پوچھا کہاں کا ارادہ ہے؟ کہا حنین کا قصد ہے جہاں جنگ ہوئی تھی (ص ۲۵۷)، یہی وجہ ہے کہ واقدی غزوات و سرایا کے جائے وقوع کے متعلق اہم اور جغرافیائی معلومات بہم پہنچائے جو بلاشبہ اس کے مطالعہ و تحقیق کے نتیجہ میں آئی ہیں۔ مثال کے طور پر وادی حنین کے سلسلہ میں لکھا ہے وادی حنین وهو واد اجوف ذو شعاب و مضايق (ص ۲۵۷)، سیرت کا جغرافیائی مطالعہ بھی واقدی کی علمی عظمت وانفرادیت کا ایک ثبوت ہے۔ (باقی)

مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ کے تفسیری نکات اور قرآنی مقدمات

ڈاکٹر سید کمال اللہ بختیاری ندوی

شیخ المفسرین حضرت مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ کا شمار بیسویں صدی کے ان مفسرین کرام میں ہوتا ہے جن کی قرآنی خدمات اور تفسیری تحقیقات کی اہمیت و افادیت اہل علم سے مخفی نہیں ہے۔ ان کی پوری زندگی قرآنیات کے لیے وقف تھی۔ چنانچہ فارغین مدارس عربیہ دینیہ کے لیے انہوں نے لاہور میں اپنے مدرسہ ''قاسم العلوم'' میں ایک خصوصی تفسیری کورس کا اہتمام کیا تھا، جس میں فارغین مدارس شریک ہوتے اور فن تفسیر میں ان سے بھرپور استفادہ کرتے تھے۔ ان مستفیدین میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور داعی احسان حضرت مولانا سید شاہ صبغت اللہ بختیاریؒ بھی شامل ہیں۔ اس خصوص میں دادا حضرت مولانا سید شاہ صبغت اللہ بختیاریؒ فرماتے ہیں ''مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ العالی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ ہوکر دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے آستانۂ عالیہ پر فروکش ہوئے اور ان ہی کے ساتھ نشست و برخاست رہی، ہم طعامی و ہم کلامی کے ساتھ حضرت اقدس کے درس حدیث، بخاری شریف اور ترمذی میں بطور سماعت شرکت کرتے رہے لیکن ان کا باضابطہ مدرسہ میں داخلہ اور مطبخ کا نظم نہیں ہوا تھا، بلکہ حضرت اقدس کے مہمان خاص رہے۔ جب سال کا آخری حصہ ہوا تو میں نے عرض کیا آپ کی ہماری جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے، یہ کہہ کر میں آب دیدہ ہوگیا، تو فرمایا ''انشاء اللہ میری اور آپ کی یکجائی اور چند دن رہے گی، وہ اس طرح کہ میں بھی حضرت مولانا احمد علی لاہوری کے درس قرآن

شعبۂ عربی، نیو کالج، چینائی۔

میں لاہور چل رہا ہوں، دیوبند سے لکھنؤ جا کر والدۂ ماجدہ سے مل کر لکھنؤ ہی سے لاہور آ جاؤں گا۔ اس پر میں نے مسرت کا اظہار کیا اور یقین کر لیا کہ ہم دونوں پھر ایک بار جمع ہوں گے۔ بحمد اللہ مدرسہ قاسم العلوم میں ہم دونوں ایک ساتھ رہے''۔

شیخ المفسرین حضرت مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ کے ان دو نامور تلامذہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور داعی احسان و مفسر قرآن حضرت مولانا سید شاہ صبغت اللہ حسینی بختیاریؒ کی یہ نمایاں خصوصیت اور یادگار خدمت رہی کہ اول الذکر نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ترجمہ قرآن کی شروعات کی تو موخر الذکر نے جامعہ دارالسلام، عمرآباد، تمل ناڈو میں ترجمہ قرآن کی بنیاد رکھی۔ اس سے قبل برصغیر کے مدارس عربیہ و دینیہ میں راست ان کتب تفاسیر ہی سے استفادہ کیا جاتا تھا، جنہیں مراجع کی حیثیت حاصل ہے، ان دو حضرات کی مساعی جمیلہ سے شمالی ہند اور جنوبی ہند کے اکثر و بیشتر مدارس میں ترجمہ قرآن کی تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔

شیخ المفسرین حضرت مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ کی قرآنی بصیرت اور ان کے درس کی خصوصیات کے تعلق سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنی کتاب ''پرانے چراغ'' میں روشنی ڈالی ہے اور شیخ المفسرین کی حیات اور خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ مولانا سید شاہ صبغت اللہ حسینی بختیاریؒ نے بھی شیخ المفسرین حضرت مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ کے تفسیر نکات اور مقدمات قرآن پر ایک مبسوط مضمون املا کروایا تھا، جسے مرتب قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔

یہ مقالہ شیخ المفسرین حضرت مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ کے تفسیری نکات اور قرآنی مقدمات پر مشتمل اور سمجھنے کے لیے ایک رہنما مقالہ اور تفسیر کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ ہے۔

دادا حضرت مولانا سید شاہ صبغت اللہ بختیاریؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے درس قرآن میں شرکت اور وہاں کے قیام کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''یہاں ایک اہم واقعہ پیش کرنا مناسب ہے، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے اپنے افتتاحی کلاس میں جب درسیات مروجہ اور مدارس عربیہ میں

درس قرآن کا نظم نہ ہونے پر سخت کلام فرمایا تو بہت سے فضلاء پر ناگوار گزرا اور
ان میں سے بہت سارے دھیرے دھیرے رخصت ہوتے چلے گئے ، صرف وہ
مخلص اور سنجیدہ طبقہ باقی رہ گیا ، جو حقیقی معنی میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ
سے مانوس ہوکر فیض یاب ہونے کے لیے آیا تھا''۔

مدرسہ قاسم العلوم لاہور میں ایک بڑا شاندار کتب خانہ تھا ، جس میں خصوصاً علم تفسیر پر کافی ذخیرہ موجود تھا ۔ اردو ، عربی ، فارسی اور انگریزی زبانوں میں تفسیر کی بہت سی اہم کتابیں تھیں اور تلامذہ کو یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ کوئی نہ کوئی تفسیر اپنے مطالعہ میں خاص طور پر رکھیں اور یہ بھی ہدایت کی جاتی تھی کہ تقریر درس قلم بند کی جائے اور جو کچھ بتایا جاتا ہے اس کو ضبط ذہن کرلیا جائے اور دوسرے دن پوچھنے پر بتایا جائے ۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا معمول تھا کہ درس سے قبل دو امتحان لیتے ۔ پہلا امتحان مطالعہ کا ہوتا ، جس میں دریافت فرماتے کہ اس آیت پر امام رازیؒ نے کیا کہا ہے ، امام بغویؒ نے کیا لکھا ہے ، امام آلوسیؒ اور صاحب کشافؒ کی تفسیری تحقیقات کیا ہیں ، تھوڑی دیر میں یہ جائزہ لے لیا جاتا کہ واقعی مطالعہ کیا گیا ہے یا نہیں ۔ پھر دوسرا درس قرآن کا امتحان ہوتا ۔

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کا خاص طرز یہ تھا کہ پوری سورت کا ایک مجموعی مضمون قرار دیتے اور اس پر بطور خلاصہ تقریر فرماتے ، پھر ہر رکوع کا مستقل ایک خلاصہ مضمون بتاتے اور پھر ماخذ پر روشنی ڈالتے کہ فلاں آیت سے فلاں آیت تک یہ مضمون مذکور ہے اور خصوصی طور پر ربط آیات کو خصوصیت سے پیش فرماتے اور قرآنیات کو دور حاضر پر منطبق کرنے کی طرف توجہ دلاتے ۔ اسی طرح دوران درس بطور تاویل اور بطور اعتبار اجتماعیات کے لیے سیاسی اور عمرانی نکات مستنبط کیے جاتے ۔ ہر ہفتہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری درس قرآن کی کاپیاں ملاحظہ فرماتے ، اگر کوتاہی دیکھتے تو سرزنش فرماتے ، مدت تعلیم تین مہینے ہوتی ، روزانہ دو نشستیں ہوتیں ، مجموعی طور پر پانچ گھنٹے ہوجاتے اور دو خاص امتحان ہوتے ، ایک آزمائشی امتحان ، دوسرا آخری امتحان ، جس کے بعد سند تفسیر عطا کی جاتی اور شاندار جلسہ تقسیم اسناد کا اہتمام کیا جاتا اور اس جلسہ میں خصوصیت سے اکابر اہل علم وفضل کو مدعو کیا جاتا ۔

شیخ المفسرین مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ کے تفسیری نکات کی روشنی میں سورۂ فیل کا عنوان ''توہین شعائر اللہ'' قرار پاتا ہے۔فرماتے ہیں کہ سورۂ فیل کے متعلق مفصل قصص، کتب تفسیر میں موجود ہیں۔بعضوں نے اس کے متعلق یہ تصریح کی ہے کہ ولادت سے پچاس دن پہلے یہ واقعہ پیش آیا تھا اور سورت مبارکہ سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ ابرہہ نامی جابر شخص نے بیت اللہ کی تذلیل کا قصد کیا تھا اور نہایت ذلیل وخوار ہوا اور آخر کار اسی ذلت وخواری میں مر گیا، اس لیے کہ توہین شعائر اللہ سے تذلیل لازمی ہے۔اب ہم اس واقعہ سے ایک کلیہ اخذ کرتے ہیں اور اصلی مضمون کو اپنی جگہ پر باقی رکھتے ہوئے اور قرآنی مقصد میں کسی قسم کا خلل نہ ڈالتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ محض ابرہہ کے ذلیل ہونے کا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اندر سارے عالم کے لیے ایک عبرت پوشیدہ ہے۔یعنی دنیا کا کوئی شخص، شعائر اللہ میں اگر کسی شعار کی بھی توہین کرے تو اس کو ذلیل و رسوا ہونا پڑتا ہے، شعائر اللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تحقیق کے مطابق بنیادی طور پر چار ہیں۔ ۱-کتاب اللہ، ۲-بیت اللہ، ۳-رسول اللہ، ۴-صلوٰۃ، اب اگر کوئی شخص ان چاروں میں سے کسی ایک کی بھی توہین کرے تو قانون الٰہی کے مطابق اس کی رسوائی لازم ہے۔

دنیا میں آج کل ہم لوگوں کی ذلت ورسوائی کے باعث پر ایک غامض نظر ڈالی جائے تو صاف طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ذلت ورسوائی محض اس لیے ہے کہ ہم میں شعائر اللہ کی تعظیم ختم ہوگئی ہے اور بے پرواہی بڑھتی چلی گئی ہے، جس نے ہم کو یہاں تک پہنچا دیا ہے۔قرآن پاک درحقیقت باری تعالیٰ کی طرف سے ایک مکتوب ہے، جو ہماری طرف بھیجا گیا ہے، لیکن ہم کو اس مکتوب کی تعظیم جیسی کرنی چاہیے ویسے نہ کی، بلکہ سطحی اور ظاہری تعظیم بھی ہم سے نہ ہوسکی، حقیقی تعظیم اس مکتوب کی تو یہ ہے کہ اس سے صحیح طور پر مقصود کاتب اور مقصد کتابت کو سمجھا جائے اور اس کے اوامر پر عمل کیا جائے اور نواہی سے احتراز کیا جائے، لیکن کسی مکتوب کو ایک ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر رکھ دینا یا تعویذ بنا کر محض گلے میں لٹکا لینا، ذرا سی عقل رکھنے والوں کے نزدیک بھی تعظیم نہیں شمار کیا جاتا، بلکہ یہ تو حقیقی معنوں میں اس کی تضحیک وتذلیل ہے۔موجودہ زمانے میں اگر ہم اپنے اعمال کو قرآن کے احکام سے موازنہ کرکے دیکھیں تو معلوم ہوجائے گا کہ ہم نے

مکتوب کی کس قدر توہین کی ہے۔ قرآن حکیم نے ہم کو تعلیم دی کہ (وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا، سورہ آل عمران: ۱۰۳) لیکن ہم میں سے کتنے ہیں جن کے دلوں میں اپنے ہم سایوں کے لیے بغض ہے، اپنے رشتے داروں کی طرف سے عداوت ہے، ہم اپنے حقیقی بھائیوں سے اس ذلیل دنیا کی ذراسی پونجی پر لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ تفصیلاً اگر ہم اپنے ایک ایک عمل کو جانچ کر دیکھیں تو شاید ہی کوئی عمل ایسا نکل سکے، جو منشائے قرآنی کے مطابق اور مدعائے خداوندی کے موافق ہو۔ علماء کے طبقے میں بھی بہت ساروں کا یہی حال ہے، وہ لوگ جن کا فرض تھا کہ اپنا تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور اصلاح باطن کرتے ہوئے تحلیہ بالفضائل وتخلیہ عن الرزائل کو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوتے اور عوام الناس کو ان چیزوں سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی کوشش کرتے مگر افسوس کہ ان کی حالت اس کے برعکس ہے ہر عربی طالب علم کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ سب سے بڑا منطقی، سب سے بڑا فلسفی، سب سے بڑا ادیب، اسی طرح سب سے بڑا صرفی و نحوی بن جائے۔ مگر کسی کے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ وہ سب سے بڑا خادم قرآن بن جائے۔ سب سے بڑا داعی اسلام بن کر دعوت کا کام کرے۔ اس کے برعکس علوم الٰہیہ کی پُر پیچ گھاٹیوں میں پریشان ہو کر رہ جاتا ہے، یہ قرآن حکیم کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟

شیخ المفسرین کے قرآنی مقدمات: شیخ المفسرین حضرت مولانا احمد علی راشدی لاہوریؒ درس قرآن شروع کرنے سے قبل، قرآن مجید سے چند اہم نکات کو بعنوان ''مقدمات قرآن'' بطور تمہید پیش فرماتے تھے۔ اختصار کے ساتھ یہاں اس پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

مقدمۂ اولیٰ، ضرورت ربط آیات: قرآن مجید تیئیس سال میں بتدریج نازل ہوا ہے اور روایات سے ثابت ہے کہ بیک وقت متعدد سورتوں کا نزول بھی جاری رہتا تھا۔ آیات برابر نازل ہوتی رہتیں، پھر رسول اکرمؐ ان آیات کی تعیین فرماتے کہ یہ آیت فلاں سورت کی ہے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ ساری آیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے اور نہ یہ کہ جس آیت کو جہاں چاہے جمع کر دیا جائے۔ رسول اکرمؐ کی اس تعیین سے ضرورت ربط آیات کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل یادداشت ہے کہ قرآن حکیم میں بعض سورتیں بالکل چھوٹی ہیں، جیسے سورۂ اخلاص، سورۂ کوثر اور سورۂ عصر وغیرہ۔ اسی طرح بعض سورتیں بڑی ہیں، جیسے سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران اور

سورۂ توبہ وغیرہ۔ اس قلت و کثرت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مضمون اقل قلیل ہے کہ چھوٹی سورت میں ختم ہوگیا، بخلاف اس کے دوسرا مضمون اتنا طویل اور مرتبط ہے کہ ڈھائی پارے میں ختم ہوتا ہے۔ اس طویل مضمون کے آپس کے ارتباط سے بھی ربط آیات کا مسئلہ عقلاً ونقلاً سمجھ میں آتا ہے، اس لیے کہ خدائے حکیم کی ذات سے یہ بات بعید ہے کہ چند مربوط جملوں کو بغیر کسی وجہ ربط کے ایک جگہ ذکر فرمادیں۔ اس لیے قرآن پاک کو بار بط سمجھنا لوازم سے ہے اور اس کے بغیر قرآن حکیم کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس خدمت کو مفسرین نے بالالتزام ادا نہیں کیا ہے اور بالعموم کتب متداولہ اس خدمت سے خالی ہیں، اس لیے ترجمہ میں اس چیز کا خاص لحاظ رکھا جائے گا۔

مقدمہ ثانیہ، استنباط احکام عامہ بہ نصوص خاصہ: قرآن پاک ہر ملک ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے نازل ہوا ہے، جیسا کہ (وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا کَافَّةً لِّلنَّاسِ ، سورہ سبا: ۲۸) سے اشارہ ہوتا ہے اور چونکہ قرآن حکیم تمام عالم کے لیے ہدایت بن کر اترا ہے، اس لیے دنیا کا ہر شخص اس کا مخاطب ہے۔ قرآن مجید میں بہت سے مواقع ایسے ہیں کہ وہاں چند جزئی واقعات کو بیان کیا گیا ہے اور ظاہری الفاظ میں کسی خاص شخص کا نام بھی لیا گیا ہے، لیکن اس سے ہرگز یہ مقصود نہیں کہ یہ مثال محض اسی قوم خاص کے لیے باعث عبرت بنے، بلکہ قرآن کا مقصد حقیقی یہ ہے کہ ہر قوم و ملت اور ہر ملک کے بسنے والے ہر زمانے میں پیدا ہونے والے یکساں اس سے عبرت حاصل کریں۔ کما قال اللہ سبحانہ (فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَارِ ، سورۂ حشر: ۲) ''عقل والو! عبرت حاصل کرو''، اس لیے ضرورت ہے کہ قرآن عزیز کو اس طرح پیش کیا جائے کہ ہر سننے والا اور ہر پڑھنے والا اپنے آپ کو قرآن کا مخاطب سمجھے اور اس لیے ضرورت ہے کہ جزئیات سے کلیات نکال نکال کر سامع و قاری کے سامنے رکھی جائیں، تاکہ وہ اپنے حالات اس پر منطبق کرکے عبرت حاصل کرے۔ مثلاً سورۂ تبت کے متعلق مفسرین کرام صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوجاتے ہیں ''نزلت فی ابی لھب'' یعنی ابولہب کے متعلق نازل ہوئی ہے، لیکن اس سے مخاطب کو خود اس کی ذات کے متعلق کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کے سامنے یہ بات نہ پیش کی جائے کہ اس کا مخاطب ہر وہ شخص ہے جو کہ تعلیم نبوی کا مخاطب ہو، نہ کہ صرف ابولہب۔ اسی کام کو انجام دینے کے لیے ہمیں قرآن پاک کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

مقدمہ ثالثہ، معنی اعتبار و تاویل: **الفرق بین التفسیر والتاویل : قال البعض : التفسیر ما یتوقع علی المنقول والتاویل صرف الآیة الی المعنی بھا متحملا لما قبلھا وما بعدھا غیر مخالف الکتاب والسنة وقد رخص فیھا اھل العلم لان الصحابةؓ لیس کل ما قالوا سمعوہ من النبی ﷺ بل حسب ما فھموا من الکتاب والسنة .**

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں سورۂ قیامہ کی تفسیر کرتے ہوئے تفسیر کی تعریف یوں فرمائی ہے، تفسیر وہ ہے جو قواعد عربیت اور قواعد لغت کے خلاف نہ ہو اور اس ذہنیت کے خلاف بھی نہ ہو، جو نزول کے وقت مخاطبین کی تھی ۔ چنانچہ بالعموم معلوم ہوتا ہے کہ کتب متداولہ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعریف کے موافق لکھی گئی ہیں ورنہ اگر منقول عن النبیؐ مشروط ہوتا تو بعض جملوں کے متعلق مفسرین کرام نے جو کوئی اقوال نقل کیے ہیں، وہ سب تفسیر نہ ہوتے ، لیکن وہ تفسیر کہلاتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مفسرین کرام نے قواعد عربیت و قواعد لغت کی مطابقت و موافقت کو ترجیح دی ہے اور اسے تفسیر کے لیے کافی سمجھا ہے ۔

تفسیر بالرائے کو اس کلیہ سے ہٹ کر سمجھنے کی ضرورت ہے، تفسیر بالرائے وہ ہے کہ مبتدع اپنی طرف سے کوئی بات بتائے ، جو جمہور کی رائے کے خلاف ہو یا کوئی بدعت ایجاد کرے اور اس کی تائید کتاب اللہ سے کرائے تو یہ تفسیر بالرائے ہے ۔ مثلاً غلام احمد قادیانی اپنی نبوت کے استدلال میں بہت سی قرآنی آیات پیش کرتا ہے اور اس سے اپنے لیے تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جیسے وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (سورۂ بقرہ:۴) کو اپنے استدلال میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ **وبنبی الآخرة ھم یوقنون** اور نبی سے اپنی ذات مراد لیتا ہے اور اپنی طرف سے من گھڑت بکتا ہے اور یہی تفسیر بالرائے ہے جو قطعاً حرام ہے ۔

اعتبار کے تعلق سے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے کسی نے پوچھا کہ صوفیہ حضرات نے قرآن پاک میں لفظ فرعون سے نفس اور لفظ موسیٰ سے عقل یا روح مراد لے کر تفسیر کی ہے، تو کیا یہ تفسیر بالرائے ہے یا نہیں؟ تو حکیم الامت نے فرمایا اعتبار کے معنی یہ ہیں کہ نصوص کے ظاہری معنی کو اپنے ظاہر پر رکھ کر بطور قیاس امثال قرآنی کو اپنے مقصود پر جاری کیا جائے

اور یہ بھی ایک قسم کا قیاس ہی ہے، جس کی نصوص سے اجازت ہے، اسی طرح جس طرح کہ قیاس فقہی کی اجازت ہے جیسا کہ سورۂ حشر میں بنونضیر کے قصے کے تحت فرمایا گیا ہے فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ (سورہ حشر:۲) ''اے عقل والو! عبرت حاصل کرو''۔ یہاں حصول عبرت کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے حال کو ان کے حال پر موازنہ کر کے دیکھو، اگر تمہارے اندر ان جیسے اعمال اور خصائل ہیں تو سمجھ لو کہ یہی معاملہ تمہارے ساتھ بھی ہوگا، جیسا کہ عاد وثمود کے تعلق سے ارشاد ربانی ہے لَقَدْ کَانَ فِی قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ (سورہ یوسف:۱۱۱)۔ تو عبرت فی القصص یہ ہے کہ غور کر کے اپنے آپ کو اس سے بچایا جائے۔ بس یہی صوفیائے کرام نے کیا ہے کہ قصص قرآنیہ کو وہ اپنے نفس پر جاری کرتے ہیں یعنی وہ ان قصص کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ ہر چیز کی نظیر اپنے اندر قائم کر کے مشبہ بہ کے احکام، مشبہ پر جاری کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کا مقابلہ فرعون کے ساتھ جابجا منقول ہے، جو کتب تفسیر میں مشرح ہے، اس کی تفسیر بھی صوفیائے کرام کے نزدیک وہی ہے یعنی حضرت موسیٰ سے مراد وہی نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور فرعون سے بھی وہی شخص مراد ہے، جو حضرت موسیٰ کے زمانے میں مصر کا بادشاہ تھا، لیکن حضرات صوفیائے کرام اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعد التفسیر المنصوص، بطور اعتبار اپنے نفس پر اس طرح جاری کرتے ہیں کہ ہمارے اندر بھی ایک چیز موسیٰ سے مشابہ ہے، یعنی روح یا عقل اور ایک چیز فرعون سے مشابہ ہے، یعنی نفس تو جس طرح فرعون کا غلبہ موسیٰ پر موجب فساد تھا اور اس کے برعکس موجب صلاح۔ اسی طرح غلبۂ نفس علی الروح، نفس کا غلبہ روح پر موجب فساد ہے اور علی العکس موجب صلاح۔ اس کے بعد وہ سارے قصے کو روح اور نفس کے معاملے پر منطبق کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہذا علی المعنی قولہ اس کی حقیقت قیاس فقہی کے قریب ہے، لیکن اتنا فرق ہے کہ قیاس کا نتیجہ بہ واسطہ قیاس مدلول نص ہوتا ہے یا مدلول نص کا مشابہ ہوتا ہے اور اس فرق کا یہ اثر ہے کہ حکم قیاس اگر مستقل نہ ہو تو تب بھی مقیس علیہ سے مقیس پر حکم متعدی کر سکتے ہیں اور حکم اعتبار اگر مستقل نص نہ ہو مشبہ بہ سے مشبہ میں تو حکم کو متعدی نہیں کر سکتے، جیسا کہ کسی بزرگ کا قول ہے ''لاتدخل الانوار قلبا فیه صفات سباعية''، (انوار ایسے دل میں داخل نہیں ہوتے، جن میں اوصاف درندگی پائے جاتے ہیں)۔

تو اگر یہ حکم کسی مستقل دلیل سے ثابت نہ ہو تو محض اس نص سے حکم تعدیہ نہیں کر سکتے اس لیے بجائے قیاس کے اگر اس کا نام تشبیہ رکھا جائے تو مناسب ہے تا کہ خلط ملط نہ ہو۔ لہٰذا علم اعتبار کا صحیح ہونا اور خلاف شرع نہ ہونا معلوم ہوا اور اسلاف سے بھی اس قسم کے نظائر موجود ہیں۔ چنانچہ حضرت رزینؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ: اَلَمْ یَأْنِ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ (سورۂ حدید:۱۶) اس میں تو خشوع کا امر ہے اور قساوت قلبی سے بچنے کی تاکید ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْآیَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (سورۂ حدید:۱۷)۔ قال ابن عباس ”لین القلوب بعد قسوتها فجعلها میتة یحی القلوب المیتة بالعلم والحکمة الا فقد علم احیاء الارض بالمطر مشاهدة ومقصوده ان هذا مثل ضربه اللّٰه تعالی لعباده یرید ان قلوبکم کالارض فلا تیئسوا من قساوتها فانها تحی بالاعمال کالارض بالغیث“ (تیسیر الاصول الی جامع الاصول) تو اب دیکھ لو کہ حضرت ابن عباسؓ نے الارض سے قلب مراد لیا ہے اور قساوت۔ اسی طرح صوفیائے کرام بطور تشبیہ موسیٰ سے روح یا عقل اور فرعون سے نفس مراد لیتے ہیں۔ درحقیقت یہی علم اعتبار ہے۔ اگر قواعد شریعت کے مخالف نہ ہو اور اسلاف سے ثابت ہو تو ایسے اعتبار کی اجازت ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بات سے یہ معلوم ہوا کہ بطور قیاس اگر جزئیات سے کلیات مستنبط کی جائیں اور ان کو بطور اعتبار پیش کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

مقدمہ رابعہ، ترجمہ قرآن کی بنیاد: ترجمہ قرآن کے سلسلے میں اصولی طور پر حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ان اصول کو ملحوظ رکھا جائے جو انہوں نے ”حجۃ اللہ البالغۃ“ اور ”الفوز الکبیر فی اصول التفسیر“ میں بیان فرمائے ہیں، یہی رائے ہمارے اکابر اور خصوصا مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی ہے۔ شیخ المفسرین مولانا احمد علی لاہوریؒ فرماتے تھے کہ ترجمہ قرآن کے سلسلے میں جو کچھ

بیان کیا جائے گا، وہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے ماخوذ ہوگا، اس لیے کہ مولانا سندھیؒ فکر ولی اللہی کے متخصص ہیں اور تبحر علمی، سیاست دانی اور اپنی جامعیت میں بے مثل ہیں، انہوں نے سالہا سال تک امروٹ، ضلع سکھر کی مسجد میں معتکف ہوکر اس عظیم الشان خدمت کو انجام دیا ہے اور کسی کو اس سے بھی زیادہ کوئی بات سمجھ میں آجائے اور وہ مذکورہ اصول کے مطابق بھی ہو تو

چشم ما روشن ، دل ما شاد

مقدمہ خامسہ، قرآن مجید کے مخاطبین: قرآن حکیم کے مخاطب خصوصا وہ ہستیاں ہیں جو سلیم الفطرت ہوتی ہیں، ممسوخ الفطرت ہستیاں قرآن حکیم کی مخاطب نہیں ہیں، سلیم الفطرت سے مراد یہ ہے کہ ان میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ متلاشی حق ہوتی ہیں۔ چونکہ ممسوخ الفطرت ہستیوں کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں، آنحضورؐ نے آخر وقت تک ابوطالب کو تلقین فرمائی اور دعوت پیش کی، باوجود اس کے کہ ان میں قبول حق کی صلاحیت ہی موجود نہیں تھی۔ اسی کی طرف باری تعالیٰ نے بایں الفاظ اشارہ فرمایا ہے: اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (سورۂ قصص:۵۶) لیکن باری تعالیٰ نے کسی وقت بھی اپنے رسولؐ کو یہ نہیں حکم فرمایا کہ اپنی دعوت کو خاص کردو بلکہ ہمیشہ یہی فرمایا کہ محض تبلیغ آپ کا فریضہ ہے اور آپؐ سارے عالم کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں۔ پھر اہل علم میں سے جن لوگوں نے آپؐ کی دعوت پر لبیک کہا، وہ امت اجابت کہلاتے ہیں اور جنہوں نے اپنی سرکشی اور کج روی کی وجہ سے آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کردیا، یا اب تک جن لوگوں نے قبول نہیں کیا ہے، تو یہ امت دعوت کہلاتے ہیں۔ یعنی رسول اکرمؐ کی امت تو سارا جہاں اور سارے ہی لوگ ہیں مگر قبول کرنے والوں نہ کرنے والوں میں فرق ہے، یہ بھی اسی کی تائید ہے کہ آپؐ بلا امتیاز سعید و شقی سارے عالم کے لیے تشریف لائے ہیں، چونکہ انبیائے کرامؑ کو ممسوخ الفطرت اور سلیم الفطرت کا علم نہیں دیا گیا تھا، یا کسی حد تک دیا بھی گیا تھا تو پھر بھی حکم خداوندی یہی تھا کہ وہ اپنی دعوت کو مجموعی حیثیت سے پیش کریں، تا کہ آگے آنے والے داعی حضرات کے لیے نمونہ ثابت ہوسکے۔

اخبار علمیہ

''۶ر کیلو میٹر طویل قرآنی نسخہ کی کتابت''

عراقی نوجوان حسین الخراسان عربی خطاطی کے عاشق ہیں اور دلکش عربی شہ پاروں کو اپنی فنی مہارت سے دلکش ترین بنانے کا ثبوت بہم پہنچا چکے ہیں۔لندن کے عربی اخبار ''الحیات'' کی خبر کے مطابق اب انہوں نے قرآن کریم کا طویل ترین نسخہ تیار کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، اس نسخہ کی لمبائی ۶ر ہزار میٹر یعنی ۶ کیلومیٹر اور چوڑائی نوے سنٹی میٹر ہوگی، اس میں خط ثلث وحیلیہ کا استعمال کیا جائے گا، ۸۰ ہزار امریکی ڈالر (۱۰ر کرور عراقی دینار) اس پر صرف ہوگا جو کاتب خود ہی اٹھائیں گے، اس کی کتابت ایک ماہ قبل شروع ہو چکی ہے اور ۱۳ر صفحات پر مشتمل پہلا پارہ لکھا جا چکا ہے، ۶ ماہ کے اندر اس کی تکمیل کا پختہ ارادہ ہے۔خیال تھا کہ سال رواں میں نجف میں منعقد ہونے والے ثقافتی اور اسلامی مخطوطات ونوادر کی نمائش کے دوران اس کا مشاہدہ کیا جا سکے گا لیکن نمائش توفی الحال ملتوی ہوگئی ہے البتہ کتابت کا کام جاری ہے۔گنیز بک کے ذمہ داران جائزہ کے لیے عراق پہنچنے والے ہیں۔

''آیت **بسم اللہ** ...... کے چھ ہزار نمونے''

بین الاقوامی شہرت کے حامل خطاط ہاشم اختر نقوی کا تعلق معدن علم و ادب لکھنؤ کے جوہری محلّہ سے ہے، انہوں نے کتابت کی بسم اللہ ہی بسم اللہ حرف سے کی۔۱۹۸۶ء میں انہوں نے ایک ہزار طرح سے بسم اللہ لکھا، یہ سلسلہ اختراع وندرت ایسا دراز ہوا کہ اب تک چھ ہزار نمونے تیار ہو چکے ہیں جن میں ہر نمونہ دوسرے سے جدا ہے، دارالقرآن ممبئی نے جب ۳۰ اوراق پر مشتمل الفی قرآن تیار کرایا تو دنیا بھر کے مشہور کاتبوں کے ساتھ نقوی صاحب کی بسم اللہ کو ۵۲ مقامات پر جگہ دی گئی۔ایک ندرت یہ ہے کہ بہت سے نمونے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں جیسے ہندی، انگریزی، بنگالی، گجراتی، اڑیا، کنڑ اور ملیالم رسم الخط سے مشابہت رکھتے ہیں۔

''جرمن زبان میں قرآن کی تقسیم''

ایک فلسطینی نوجوان نے جرمنی کے کولون نامی شہر میں گھر گھر جرمن زبان میں قرآن کو پہنچانا اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے، اس مہم میں تین لاکھ قرآنی نسخے تقسیم ہو چکے ہیں۔اسرائیلی اخبار ''ہارٹس''

نے اس خبر پر رائے زنی کرتے ہوئے جرمن پولیس کو متنبہ کیا ہے کہ اس قسم کا عمل بنیاد پرستی اور شدت پسندی کو فروغ دے سکتا ہے، جبکہ جرمنی کے سابق (چانسلر) نے اس نیک عمل کی حوصلہ افزائی کی اور اسٹال سے خود جا کر قرآن حاصل کیا۔ جرمنی کے ۱۳۰۰ اسٹالوں پر قرآن مجید کی کاپیاں دستیاب ہیں۔

''موریطانیہ میں فقہ مالکی کی کتابیں نذر آتش''

العربیہ چینل کی رپورٹ کے مطابق پچھلے دنوں افریقی ملک موریطانیہ میں ''ایرا'' نامی ایک غیر سرکاری تنظیم نے امام مالکؒ ابن انسؓ کی کتابوں کو نذر آتش کر دیا، تنظیم کا کہنا ہے کہ اسلام غلامی کی مخالفت کرتا ہے جب کہ فقہ مالکی میں اس نظریہ کو فروغ دینے کی شہادتیں موجود ہیں نیز مسلک مالکی انسانی آزادی کے خلاف بھی ہے، اسی نقطہ نظر کے سبب غلامی کے خلاف اس ملک میں آواز نہیں اٹھائی جاتی۔ عرب ذرائع کے مطابق ایرا کو برطانیہ کی پشت پناہی حاصل ہے اور وہ سوڈان اور عام افریقی باشندوں کو اس احساس میں مبتلا کرنا چاہتی ہے کہ ان کی پس ماندگی وافلاس اور جہالت کا اصل سبب فقہ مالکی ہے، اس نار وا فعل کے خلاف مراکش، افریقہ، اردن، بحرین، سوڈان اور مصر وغیرہ میں شدید احتجاج ہو رہا ہے اور موریطانیہ کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں اور صحافتی، قانونی اور حکومتی حلقوں کی جانب سے اس فعل شنیع کی شدید مذمت کی جارہی ہے، واضح رہے کہ اسلام اور غلامی کے حوالہ سے یہ معاملہ تقریباً دس برس سے موریطانیہ میں جاری ہے اور مالکی مذہب کے علمائے کرام کے فتاوے جمع کر کے شائع بھی کیے گئے ہیں۔ جس میں واضح طور پر غلامی کی نفی کی گئی ہے۔ ''تواصل'' نامی تنظیم نے اس سلسلہ میں وہاں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

''نکاح مسیار کی مشروط اجازت''

الجزائر سے شائع ہونے والے اخبار ''الشرق'' کے مطابق الجزائر کے علماء ومفتیان کے متفقہ فیصلہ کے بعد نکاح مسیار کو قانوناً منظور کر لیا گیا ہے، اس میں عام نکاح کی طرح گواہوں کی موجودگی اور ولی کی اجازت ضروری ہے تاہم شوہر پر بیوی کے نان ونفقہ اور رہائش کی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی اور نکاح کے بعد منکوحہ اپنے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا نظم خود کرتی ہے۔ البتہ اولاد کی پرورش و پرداخت کا ذمہ دار شوہر ہوتا ہے۔ اکثر اسلامی ملکوں میں نکاح مسیار قانوناً ممنوع ہے، چونکہ اسلام نکاح کا بنیادی مقصد افزائش نسل کو قرار دیتا ہے اور اس نکاح سے زوجین بچوں کی پیدائش وتوالد سے فرار اختیار کرتے ہیں اور یہ عمل خاندانی منصوبہ بندی اور نکاح کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے

اس لیے درست نہیں۔ چونکہ الجزائر میں نکاح مسیار کرنے والوں کی تعداد ۸۰ ہزار سے متجاوز ہوگئی ہے، اس لیے علماء نے فواحش و منکرات سے تحفظ کے لیے اس کی اجازت دی ہے۔ الجزائر کے علاوہ بعض دوسرے افریقی ممالک مصر، مراکش، سوڈان اور موریطانیہ وغیرہ بھی نکاح مسیار کا سہارا لے رہے ہیں۔

''انڈونیشیا کے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں پر ان کی بیویوں کا حق''

عربی اخبار ''الیوم'' کی خبر کے مطابق تحفظ حقوق نسواں کے نام پر انڈونیشیا کی جورونتالو کی صوبائی حکومت نے ایک قانون پاس کیا ہے، جس کی رو سے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں پر ان کی بیویوں کا حق ہوگا اور اپنی تنخواہ خود وصول کرنے کے حق سے سرکاری ملازمین قانوناً محروم کردیے گئے ہیں اور اپنی کمائی بیوی کی مرضی کے مطابق ہی خرچ کرسکیں گے، زبردستی وصول کرنے پر خواتین کے خلاف تشدد کے قوانین کے تحت ان پر کارروائی کی جائے گی، رپورٹ کے مطابق اس کا مقصد ملک میں ازدواجی زندگیوں کو درپیش مسائل و مشکلات پر قابو پانا ہے، فی الحال اس قانون کو ایک صوبہ میں نافذ کیا گیا ہے، اس فیصلہ میں ماہرین اقتصادیات و نفسیات سے مشورہ بھی کیا گیا ہے، واضح رہے کہ انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، یہاں کاروبار اور آمدنی کے ذرائع بہت کم ہیں، سرکاری ملازمین تنخواہیں گھریلو ضرورتوں پر خرچ کرنے کے بجائے غیر ضروری اور نامناسب کاموں پر صرف کردیتے ہیں جس کے سبب عورتیں ملازمت کے لیے مجبور ہوجاتی ہیں یا پھر غیر ملکیوں سے شادی کرکے انہیں اپنے ملک کو خیرآباد کہنا پڑتا ہے اور بالآخر تال میل نہ ہونے سے طلاق ہوجایا کرتی ہے۔ اسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے یہ قانون منظور کیا گیا ہے۔

''الفاروقؓ کی گجراتی زبان میں قسط وار اشاعت''

گجراتی زبان میں ''فاروق ویکلی'' نام سے ۲۰۰۰ء سے ایک ہفتہ وار اخبار شائع ہورہا ہے، اس کے ایڈیٹر، ناشر اور مالک جناب یوسف اے جت ہیں، دارالمصنّفین کی کتابوں بالخصوص علامہ شبلیؒ سے ان کو خاص عقیدت ہے، انہوں نے الفاروقؓ کا گجراتی زبان میں قسط وار ترجمہ شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اب تک نو قسطیں شائع ہوچکی ہیں۔ اس سے قبل خلفائے راشدینؓ کا گجراتی زبان میں ترجمہ اسی اخبار میں وہ شائع کرچکے ہیں۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

تصوف کیا ہے

کاشانۂ ادب، سکٹہ دیوراج
مغربی چمپارن (بہار)

محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

پروفیسر الطاف احمد اعظمی صاحب کے مقالہ ''تصوف کیا ہے؟'' پر اپنا ردعمل ارسال کرر ہا ہوں، موصوف کا تصوف کو مطلقاً غیر اسلامی قرار دینا مبنی بر انصاف نہیں ہے۔ جامعہ ام القریٰ کے سابق استاد ڈاکٹر محمد علوی المالکی نے تصوف کو مظلوم قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

التصوف ذالک المظلوم المتهم، قليل من ينصفه، بل بلغت الجراة ببعضهم انه جعله من صفات الذم والقدح التى تسقط بها الشهادة وتزول بها العدالة، فيقول: فلان ليس بثقة ولايقبل خبره، لماذا؟ لانه صوفى! لذا احببت ان انقل كلام ائمة الدين الذين هم اركان التصوف.'' (ڈاکٹر عبدالرزاق گیلانی ''الشیخ عبدالقادر جیلانی''، ص:۱۵۳، مطبوعہ حزب القادریہ لاہور، بحوالہ کتاب ''**مفاهيم يجب ان تصحح**''، ص:۳۵)

تصوف وہ مظلوم علم ہے جس کو مخالفین نے بدنام کرنے کی کوششیں کی ہیں اور جس کے ساتھ بہت کم لوگوں نے انصاف کیا ہے بلکہ بعض لوگوں کی جرأت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ انہوں نے تصوف کو ذم وقدح (یعنی طعن وتشنیع) کی صفات میں شمار کیا ہے جس سے صاحب تصوف کی شہادت ساقط اور عدالت مجروح ہوجاتی ہے، اس طرح تصوف پر اعتراض کرنے والے کہتے ہیں کہ آج فلاں آدمی لائق اعتماد اور اس کی چیز قابل تسلیم نہیں، چوں کہ وہ صوفی ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میں نے وہ ائمۂ دین جو تصوف کے اہم ارکان ہیں ان کے افکار ونظریات اپنی کتاب میں نقل کیے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علوی نے اپنی کتاب ''مفاھیم یجب ان تصحح'' میں حضرت جنید بغدادیؒ، ابو یزید بسطامیؒ، ذوالنون مصریؒ، بشر الحافیؒ اور ابوسلیمان الدارانیؒ کے افکار و نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے تصوف کی مدافعت کی ہے۔ (ایضاً)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (۶۶۱ھ-۷۸۲ھ) نے اپنے مکتوب نمبر ۲۲ میں لکھا ہے کہ اہل طریقت کے یہاں تصوف کی تین قسمیں ہیں ا۔صوفی ۲۔متصوف ۳۔مشتبہ، شیخ منیریؒ نے اول الذکر دو طبقے کو راہ صواب پر قرار دیا ہے اور تیسرے طبقہ کو ریا کار اور تصوف کو بدنام کرنے والا قرار دیا ہے۔ (ترجمہ مکتوبات صدی، مکتوب ۲۲، ص ۱۷۵، ناشر جسیم بکڈپو، اردو بازار، جامع مسجد نئی دہلی)

علامہ اقبال (۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) کو تصوف کا سب سے بڑا ناقد تصور کیا جاتا ہے، وہ اپنی تصنیف تاریخ تصوف میں رقم طراز ہیں:

''تصوف کا لٹریچر نہایت وسیع ہے اور اس کے دائرے کے اندر مختلف الخیال مصنّفین آباد ہیں جن میں بعض مخلص مسلمان ہیں، بعض محض اپنے الحاد و زندقہ کو تصوف کی آڑ میں چھپاتے ہیں اور بعض نیک نیتی سے غیر اسلامی فلسفے کو فلسفۂ اسلامی تصور کرتے ہیں، ہم مختصر طور پر یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ نظری اور عملی پہلو سے وہ کون سا نصب العین ہے جس پر ہم معترض ہیں ...... یہ ظاہر ہے کہ عام طور پر متصوفین کے دو گروہ ہیں، اول وہ گروہ ہے جو شریعت محمدیہ پر قائم ہے اور اسی پر مخلصانہ استقامت کرنے کو انتہائے کمال انسانی تصور کرتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے قرآن شریف کا مفہوم وہی سمجھا جو صحابہ کرامؓ نے سمجھا تھا، جس نے اس راہ پر کوئی اضافہ نہیں کیا جو رسول اللہؐ نے سکھائی تھی، جس کی زندگی صحابہ کرامؓ کی زندگی کا نمونہ ہے، جو سونے کے وقت سوتا ہے، جاگنے کے وقت جاگتا ہے، جنگ کے وقت میدان جنگ میں جاتا ہے، کام کے وقت کام کرتا ہے، آرام کے وقت آرام کرتا ہے۔ غرض اپنے اعمال و افعال میں اس عظیم الشان اور سادہ زندگی کا نمونہ پیش کرتا ہے جو نوع انسانی کی نجات کا باعث ہوا، اس گروہ کے دم قدم کی بدولت اسلام زندہ ہے، زندہ رہا اور زندہ رہے گا اور یہی مقدس گروہ اصل میں صوفی کہلانے کا مستحق ہے، راقم الحروف اپنے آپ کو ان مخلص بندوں کی خاک پا تصور کرتا ہے، اپنی جان و مال و

عزت وآبرو ان کے قدموں پر نثار کرنے کے لیے ہر وقت حاضر ہے اوران کی صحبت کے ایک لحظہ کو ہر قسم کے آرام وآسائش پر ترجیح دیتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو شریعت محمدیہ کو خواہ اس پر قائم بھی ہو محض ایک علم ظاہری تصور کرتا ہے۔ایک طریق تحقیق کو جس کو وہ اپنی اصطلاح میں ''عرفان'' کہتا ہے، علم پر ترجیح دیتا ہے اور اس عرفان کی وساطت سے مسلمانوں میں وحدت الوجودی فلسفے اور ایک ایسے نصب العین کی بنیاد ڈالتا ہے جس کا ہمارے نزدیک مذہب اسلام سے کوئی تعلق نہیں ۔ (تاریخ تصوف ،ص ۳۱-۳۲،مطبوعہ مکتبہ الحسنات دہلی)

علامہ اقبال نے بھی تصوف کو مطلقاً غیر اسلامی قرار نہیں دیا ہے، بلکہ ان کے نزدیک دوسرے طبقہ کے افکار ونظریات ہی قابل اعتراض ہیں۔

پروفیسر الطاف احمد اعظمی صاحب نے اپنے مکتوب (معارف فروری ۱۲ء) میں لکھا ہے:

''علامہ حمید الدین فراہیؒ بھی طریقۂ صوفیہ کے ناقد تھے''۔

لیکن علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) نے لکھا ہے کہ مولانا حمید الدین، مولانا وارث حسن صاحب سے بیعت تھے۔حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ رقم طراز ہیں:

''آخر زمانے میں ان (علامہ شبلی) میں روحانی جستجو کی خلش پیدا ہوگئی تھی۔اسی زمانے میں بعض صوفیہ سے بھی ملاقاتیں کیں ۔ایک دفعہ ایک ملاقات میں مولانا وارث حسن صاحب نے جن سے مولانا کے بھائی (مولانا) حمید الدین الہ آباد یونیورسٹی کی عربی کی پروفیسری کے زمانے میں جو شاید ۱۹۱۰ء ہو بیعت ہو چکے تھے، مولانا کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مولانا نے تقلیدی بیعت پسند نہیں کی مگر ان کو مانتے تھے''۔(حیات شبلی ،ص ۸۳۲)

سید صاحبؒ مولانا وارث حسن صاحب کا مختصر تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کوڑا جہان آباد ان کا وطن تھا۔مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے فیض حاصل کیا تھا۔لکھنؤ کی شاہ پیر محمد صاحب کی مسجد میں ہی قیام فرمایا تھا، وہیں وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے ۔لکھنؤ کے بہت سے تعلیم یافتہ اصحاب نے ان سے تربیت پائی اور بہت سے شہروں میں ان کے فیض روحانی نے وسعت حاصل کی ۔خاکسار بھی ان کی زیارت سے بارہا سعادت مند ہوا''۔(ایضاً)

راقم ناچیز کے والدین بھی مولانا شاہ وارث حسن سے بیعت تھے۔ راقم کے والد مرحوم نے اپنے پیرومرشد کے نام پر راقم کا نام وارث حسن رکھا۔ خیر یہ تو ضمنی بات تھی کہنا یہ ہے کہ گمراہ صوفیہ پر ہر زمانے کے علماء نے تنقید کی ہے۔ اس میں علامہ فراہیؒ کی کیا خصوصیت ہے؟ محی الدین ابن العربی (۱۱۶۵ء-۱۲۲۴ء) پر مشہور فقیہ عزالدین بن عبدالسلام (ت ۶۶۰ھ) نے زندیق کا فتوی صادر کیا تھا لیکن عزالدین بن عبدالسلام نے بذات خود ابوالحسن شاذلی سے درس تصوف لیا تھا۔ اگر تصوف مطلقاً خلاف اسلام ہوتا تو علامہ حمیدالدین فراہیؒ حضرت مولانا شاہ وارث حسن سے بیعت نہیں ہوتے۔

محی الدین ابن العربی کے افکار و نظریات سے اختلاف کے باوجود طبقہ صوفیہ میں جنید بغدادی، ابراہیم بن ادہم، ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، سہل بن عبداللہ تستری، شیخ عبدالقادر جیلانی اور عدی بن مسافر کی حافظ ابن تیمیہ (۶۶۱ھ-۷۲۸ھ) بہت تعریف کرتے تھے اوران کے لیے دعائے خیر کرتے تھے۔ (الشیخ عبدالقادر جیلانی، ص ۱۵۱، بحوالہ مجلّہ الفتاوی، ص ۲۳۳)

والسلام

(جناب) وارث ریاضی

تصوف

وسئی روڈ، تھانہ،
مہاراشٹر

برادر گرامی قدر

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

معارف میں تصوف کے موضوع پر پروفیسر الطاف احمد اعظمی صاحب کے شائع شدہ مضمون پر بالغ نظر قارئین کے علمی تاثرات بے حد قابل قدر ہیں، ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس اور خالد عبادی صاحب نے اپریل کے شمارہ میں اس موضوع کی نزاکت اور معارف کی علمی و تحقیقی روایت کا بھرپور احساس دلایا ہے۔ اور مئی کے شمارہ میں مولانا ہلال احمد قادری صاحب کے

عالمانہ استدراک نے تو دل کو چھولیا ہے۔ قادری صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مقالہ نگار نے ظہور ذات اور ظہور صفات میں خلط مبحث کر دیا ہے۔ بلاغت کا ایک ادنی طالب علم بھی ''**ان فی جسدی اسدا له زئیر**'' کی معنویت سے بخوبی آشنا ہے۔ وہ انسان اور شیر کے حلول واتحاد کا تصور بھی نہیں کر سکتا ہے۔ وحدۃ الوجود کی تشریح میں یہ ایک اہم اور بنیادی نکتہ ہے۔ ہمارے ملک کے آٹھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم، مفسر اور صوفی بزرگ مخدوم علی مہائمی نے اس موضوع پر ایک گراں قدر رسالہ لکھا ہے۔ جس میں وجود اور موجودیت کے فرق کی توضیح کی ہے۔ انہوں نے ان دونوں کے درمیان اشتباہ کو عموم بلویٰ بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''**ولا ینافی ایضا حمله العقلی بالاضافة ای تعلقه بالمحل مثل تعلق المحمولات العقلیة کالماهیة والامکان علی ان هذه الامور ای الاشتراک والقول بالتشکیک والحمل العقلی لیس بالحقیقة للوجود بل للموجودیة التی اشتبهت علی العامة بالوجود**''۔

اگر ممکن ہو تو معارف میں اس موضوع پر قادری صاحب کا ایک مقالہ شائع کیا جائے۔ معارف شبلی وسلیمان کی علمی روایت کا ترجمان ہے۔ اس میں سطحی اور غیر سنجیدہ مضامین کی اشاعت سے گریز کرنا چاہیے، خدا کا شکر ہے کہ معارف کو علمی و تحقیقی روایت سے مربوط رکھنے میں قارئین کا عمدہ تعاون آپ کو حاصل ہے جو یقیناً معارف کے لیے ایک فال نیک ہے۔

والسلام

محمد عارف عمری

تصوف

میڈیکل روڈ
علی گڑھ
۱۲/۵/۲۷ء

محترم السلام علیکم

معارف کا میں باقاعدہ یا باضابطہ قاری نہیں کبھی کوئی کرم فرما پہنچا دیتے ہیں تو پڑھ لیتا ہوں لیکن معارف کو پسند کرتا ہوں، اپنے نام کے اعتبار سے معرفت، علم وعرفان سے لبریز

مضامین شائع ہوتے ہیں، میں فارسی بھی نہیں جانتا، بہت معمولی علم، کچھ سمجھ لیتا ہوں کچھ پوچھ لیتا ہوں، معارف اپریل پیش نظر ہے اور جنوری و فروری میں معارف میں ایک مضمون تصوف پر آیا تھا، پھر اس پر چند خط آئے۔ مدیر محترم میں ایک ادنی انسان مگر معارف دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی سے ایک قلبی لگاؤ عقیدت کی حد تک رکھتا ہوں اس بنا پر آپ سے التجا کرتا ہوں، گزارش کرتا ہوں، آپ تصوف پر نہ کچھ چھاپیے نہ لکھیے! یہ بڑا الجھا ہوا مسئلہ ہے اور فی زمانہ علم کم عالم بہت۔ تصوف پر علامہ شبلیؒ، مولانا عبدالسلامؒ اور مولانا عبدالماجدؒ نے بہت واضح لکھا ہے۔

سچ کہتا ہوں آج کا مولوی جاہ پرست، عالم، نام و نمود کا شیخ اور مغربی علم و تہذیب کا پروردہ، پروفیسر، تصوف کو نہیں جانتا اور حقیقت یہ بھی ہے کہ ظالم بادشاہ سے زیادہ جاہل صوفی اور دنیادار مولوی نے اسلام کو نقصان پہنچایا اور تصوف کو مسخ کر ڈالا، جبکہ تصوف اسلام سے الگ نہیں عین اسلام ہے، بس بات اتنی ہے کہ دین اور تصوف عقل سے نہیں دل سے سمجھنے کی چیز ہے۔ عشق اور دل دو ہی چیز کائنات میں ہیں کام کی، دین کی روح!

علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے بد دماغ
جو بجھا دیتی ہے سینوں میں محبت کے چراغ
(جوش ملیح آبادی)

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بیچارا نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم
(علامہ اقبال)

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا
عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہوجائے
(فانی)

اشعار تو سو پچاس لکھ سکتا ہوں تصوف اور فقیر یا قلندر کی تعریف بھی لکھ سکتا ہوں مگر......
صفحہ ۳۰۹ پر خط کا ایک جملہ ''دل سوز سے خالی ہو تو ساز اٹھا کیا'' دل میں اتر گیا، مکتوب نگار کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اہل علم اہل قلم سے اس جملہ کی روشنی میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ حمد

پاک نعت پاک یا دین اور تصوف پر جو لکھیں وہ بے ریا لکھیں، حسن عقیدت سے لکھیں، نام ونمود صلہ اور تحسین سے بے پرواہ بے غرض لکھیں۔ جزا اللہ دے گا۔

فقط والسلام

نیاز کیش ثاقب صدیقی

تصوف

تغلق آباد، نئی دہلی

۹/اپریل ۲۰۱۲ء

مکرمی سلام مسنون

مضمون تصوف کیا ہے؟ اس اعتبار سے ''کثیف'' تھا کہ اس میں تصوف وفلسفہ کے خشک مباحث زیادہ تھے، اسی ''کثافت'' کو معتدل بنانے کے لیے ایک نعت اور ایک مناجات بھیج رہا ہوں، کسی قریبی اشاعت میں شامل فرمالیں گے، لطافت اور کثافت میں گہرے تعلق کے بارے میں غالب نے خوب کہا ہے ۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

خاکسار

الطاف احمد اعظمی

الحصن المتین فی احوال الوزراء والسلاطین

ریاض

۱۲/رجب ۱۴۳۳ھ

محترمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپریل کے شمارے میں برادرم پروفیسر مسعود انور علوی کے قلم سے عباس مرزا کی کتاب **الحصن المتین فی احوال الوزراء والسلاطین** کا تعارف (ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے

قلمی نسخہ کی روشنی میں) نظر سے گذرا۔

کتاب مذکور کا ایک ایڈیشن ۱۹ سال قبل ۱۹۹۳ء میں دارالکتاب الجامعی قاہرہ سے ۲۹۵ صفحات میں شائع ہو چکا ہے۔ مرتب کا نام محسن محمد حسن سلیم ہے۔ کتاب کے نام میں "**ونواب الهند فی أود لکهنو**" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطہ کا ایک عکس **معهد المخطوطات العربیه** قاہرہ میں محفوظ ہے اور اسی عکسی نسخہ پر قاہرہ کے ایڈیشن کی بنیاد ہے۔ مرتب نے مقدمہ میں یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ آصفیہ کے نسخے کے سوا کوئی اور نسخہ اس کتاب کا موجود نہیں ہے۔

آصفیہ کا نسخہ نامکمل ہے۔ آخر کے دو باب اس میں موجود نہیں۔ نیز پہلا باب بھی نواب سعادت علی خان کے تذکرہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ گویا اس نسخے پر مبنی مطبوعہ ایڈیشن بھی ناقص ہے۔

علوی صاحب نے لکھا ہے کہ آصفیہ اور نیشنل آرکائیوز نئی دہلی میں کلکتہ کے مخطوطے کی ''نقول'' ہیں۔ یعنی اصل نسخہ کلکتہ کا ہے۔ کلکتہ کا نسخہ میرے سامنے ہے اس میں مجھے آصفیہ کے نسخے کی آخری فصل "**فصل فی وفیات الأعیان**" اپنی جگہ پر نظر نہیں آئی۔ بہر حال تینوں نسخوں کی روشنی میں اس کتاب کا تنقیدی متن مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ محمد سمیع اللہ اسد کا کام اگر معیاری ہو یا تھوڑی سی محنت سے اسے معیاری بنایا جاسکتا ہو تو اسے شائع کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

والسلام

محمد اجمل اصلاحی

ڈاکٹر حمید اللہ کی یاد

۵-۶-۱۷۵، آغا پورہ،
حیدر آباد ۵۰۰۰۰۱۔
۱۰ر مئی ۱۲ء

محترمی و مکرمی

السلام علیکم

میرا قیام امریکہ میں ہے اور سال میں چند دن کے لیے حیدر آباد آیا کرتا ہوں۔ آپ کا رسالہ برسوں سے گھر آتا رہا ہے۔ چچا ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم کے فرانس جانے

کے بعد چچا حبیب اللہ نے جاری رکھا پھر کچھ دن میری بیوی اور بعد میں میرے نام آتا رہا۔

ایڈیٹر صاحب مرحوم (مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ) سے تعارف تھا اوران کی خواہش پر چچا ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے نام آئے ہوئے خطوط اشاعت کے لیے روانہ کیے۔ کچھ خطوط معارف میں شائع بھی ہوئے لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ وعدہ تھا خطوط کو شائع کرنے کے بعد واپس کردیں گے اوران خطوط کو میری بہن کے پاس روانہ فرمائیں گے۔ جواب تک نہیں ملے جو خطوط شائع ہوئے ہیں اور جو باقی خطوط شائع نہیں ہونے والے ہوں تو یہ مہربانی ان تمام خطوط کو میری بہن کے پاس روانہ کریں

Mrs. Ameenuddin, 328/3 New No 110, Dewans Sahab Garden, T.T.K. Road, Chennai (Madras) 600014

چچا حمید اللہ مرحوم پر کئی مضامین اور کتابیں شائع ہوئیں جن میں کچھ تو نام نہاد خاندان والوں کی تھیں جن میں فرضی باتوں کو لکھا گیا۔اس کے رد کے طور پر ڈاکٹر سعیدہ نے چچا صاحب کی تحریروں سے ''سرگزشت ڈاکٹر حمید اللہ ان ہی کی تحریروں سے'' لکھی۔معارف کو بھی ایک کاپی تقریباً ایک سال پہلے تبصرہ اور تنقید کے لیے روانہ کی گئی تھی اب تک اس کی رسید معارف کے ذریعہ نہیں ملی۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کو معارف سے خاص دلچسپی رہی اوران کے بہت سے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔قارئین معارف کو تبصرہ اور تنقید سے ان کے صحیح حالات معلوم ہوسکتے تھے۔

شکریہ

عطاء اللہ

دارالمصنّفین

گلفشاں، ساجد علی روڈ
قاضی پور خورد، گورکھ پور

محترم السلام علیکم

دارالمصنّفین سے میرا تعلق اپنے بزرگوں کے واسطے سے بچپن سے ہی رہا، میرے

ماموں قاضی تلمذ حسین صاحب مرحوم (جو ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے پرنسپل تھے اور انہوں نے ہی مثنوی مولانا روم کو بہت ہی خوبی سے ترتیب دے کر مرأۃ المثنوی کے نام سے شائع کی تھی) کو شاہ ایران نے ایران کے سب سے بڑے اعزاز سے سرفراز کیا تھا، ماموں صاحب سے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ذاتی تعلقات تھے اور میں نے ان کے پاس مولانا کے کئی خطوط بھی دیکھے تھے، ایک بار مولانا ندوی ماموں صاحب کے مہمان بھی رہے ہیں، جاڑوں کا زمانہ تھا اور میں نے مولانا کو سلام کیا اور ان کی دعائیں لیں، اس وقت مولانا شیروانی اور صافہ پہنے ہوئے تھے لیکن پاجامے کی جگہ گرم پتلون تھی۔

مولانا شبلیؒ نے اپنے چند ہم عصروں کے ساتھ جس مقصد سے دارالمصنّفین قائم کیا تھا اس نے بخوبی ان مقاصد کی تکمیل کی، اس وقت سے آج تک ادارہ بہت سے نشیب و فراز سے گزرا لیکن اس کے پائے استقامت کو جنبش نہیں ہوئی، زمانہ اپنے محور پر گھومتا رہتا ہے اور مساعد و نامساعد حالات سے گزرتا رہتا ہے، طوفان بڑے، چھوٹے، پتھر، پہاڑ سے ٹکراتے رہتے ہیں لیکن پہاڑ مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ پر کھڑا رہتا ہے، موجودہ دور بھی گزر جائے گا، انشاءاللہ دارالمصنّفین اپنی پرانی شان اور توانائی سے قائم رہے گا۔

والسلام
محمد حامد علی

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے شذرات

78-C,
OPF Housing Scheme
Raiwind Road
Lahore,Pakistan
۲۷/مئی ۱۲ء

محترمی مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے فضل سے نوازے۔ آپ کے ہر لفظ کو تاثیر عطا فرمائے۔ آمین

ماضی قریب میں کچھ تحریریں ارسال خدمت کی ہیں۔ امید ہے آپ تک پہنچ گئی ہوں گی، آپ کی توجہ کا محتاج ہوں، استقبال رمضان شریف کے حوالے سے ایک مضمون بعنوان روزہ اور

ایک مقالہ بعنوان علم طب میں مسلمانوں کا حصہ ارسال خدمت ہے۔شائع فرما کر ممنون فرمائیں گے۔ایک عریضہ بھی ملفوف تھا،جس میں موسیو لیبان کی کتاب کے حصول کی خواہش کا اظہار کیا تھا، نیز علامہ شبلی نعمانیؒ کی مشہور تصنیف الفاروقؓ کے قدیم نسخہ کا بھی طالب ہوں۔کراچی میں محترمہ ڈاکٹر مہ جبین زیدی صاحبہ نے صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے لکھے ہوئے شذرات، جو رمضان میں شائع ہوئے ، انہیں کتابی شکل میں شائع کر دیا، میں نے فون پر آپ سے گفتگو کے دوران میں اس کا ذکر کیا تھا۔ان کے نام ایک خط لکھا جس کی عکسی نقل ارسال ہے۔ویسے موصوفہ کی طرف سے جواب کی توقع نہیں۔

میں ایک طویل عرصے سے ذیابیطس اور قلب کے عارضے کا شکار ہوں۔آپ کی خصوصی دعاؤں کا محتاج ہوں۔برادرم سجاد الٰہی صاحب سے رابطہ (بذریعہ فون) رہتا ہے،ان کی محبت،شفقت اور ہمدردی کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

والسلام مع الاکرام

ایم اختر مسلم

دارالمصنّفین کا سلسلۂ مکاتیب

وفیات

مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی مرحوم

افسوس کہ کلکتہ کی معروف، متحرک اور مرنجاں مرنج شخصیت یعنی مولانا حکیم عرفان الحسینی گذشتہ اپریل میں دنیا کی اس بزم فانی سے رخصت ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کلکتہ کے مشہور اور نہایت قابل احترام عالم، مفسر قرآن حکیم محمد زماں حسینی کے صاحبزادے تھے، قدیم تہذیب اور اسلاف کی دینی و علمی روایتوں کی امانت ان کو ورثہ میں ملی اور انہوں نے اس کو نبھایا بھی بڑی خوبی سے، اپنے عظیم والد کے نقش قدم پر انہوں نے کلکتہ بلکہ پورے بنگال میں دیوبند، ندوہ، امارت شرعیہ جیسے اداروں کی نمائندگی بڑے اخلاص و استقامت سے کی، وہ ندوہ کی مجلس انتظامی کے اہم رکن رہے، مسلم پرسنل لابورڈ میں بھی ان کی موجودگی اپنا احساس دلاتی، دارالمصنّفین اور معارف سے تعلق خاندانی رشتوں کی طرح استوار و پائدار رہا، کلکتہ کی مصروف ترین زندگی میں وہ تحریر کے لیے وقت نکال لیتے، روزنامہ آزاد ہند میں ان کا تفسیری اور مذہبی کالم بڑی پابندی سے آتا اور قارئین اس کے منتظر رہتے، ہم نے ان کو اس وقت دیکھا جب وہ بڑے صحت مند اور چاق چوبند تھے لیکن ادھر کئی برسوں سے عالم اس کے برعکس نظر آیا، آگ کے خاک ہونے کا منظر پرانا ہے لیکن ابتدا و انتہا کے فاصلے جب سمٹتے ہیں تو یہی منظر حیرانی کا سبب بن جاتا ہے، کلکتہ کے قاسمی دواخانہ کی رونق عرفان صاحب کے دم سے تھی، جس کی شکل میں مذہب، علم، ادب، شعر، حکمت اور کسی حد تک صحافت و سیاست کے سات رنگوں نے کلکتہ کے آسمان پر ایک قوس وقزح بکھیر دی تھی، مرحوم نے ان رنگوں کو پھیکا نہیں ہونے دیا، محبت کی گرمی اور گفتار کی گلفشانی، بھولنے کی چیز نہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور خاندان کو اور کلکتہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

ع-ص

مولانا امین الدین شجاع الدین مرحوم

خبر آئی کہ مولانا امین الدین شجاع الدین بھی اپنے خالق و مالک حقیقی سے جا ملے، یقین نہ آنے کے چند لمحوں کے بعد پھر اسی یقین کا اقرار کرنا پڑا کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں تو واپس اسی کے جوار رحمت میں جانا ہی ہے۔

وہ ابھی ایسے نہ تھے کہ نام کے ساتھ مرحوم لکھا جائے، خدا جانے کتنی صلاحیتیں تھیں جو اب بھی ظہور کی منتظر تھیں، ان کا نام اچانک تعمیر حیات اور بانگ حرا کے صفحات پر دلکش، پراثر اور البیلی تحریروں کے ساتھ سامنے آیا، ان کے اداریے نظر شوق کو متوجہ کرتے، مقبولیت تھی کہ ان کے اداریوں کا ایک مجموعہ نقوش فکر و عمل کے نام سے مرتب ہوا، بھیونڈی کی زمین سے ندوہ کے آسمان تک کا سفر، تیز رفتار بھی رہا اور روشن بھی، کیا خبر تھی کہ یہ خوش درخشید گی، شعلہ مستعجل کی مبتدا تھی، آخری ملاقات کب ہوئی یاد نہیں لیکن ان کا تبسم اور محبت کی آنچ سے گداز ہاتھوں کا گرم جوش مصافحہ ضرور یاد ہے، وفیاتی مضامین کا مجموعہ ''ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' عنایت کیا، ابھی معارف میں اس کے ذکر کی فرصت بھی نہیں ملی کہ وہ خود اس کتاب کا عنوان بن گئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے سالک رام تک خدا جانے دل کی دنیا میں آباد کیسے کیسے مکینوں کا نوحہ کہنے والے نگری نگری پھیرا لگا کر وہ اپنے سفر کی منزل پہنچ گئے، پس کارواں سخنوری کے ایسے نقوش قائم کرتے ہوئے جن کی چمک میں خون جگر کی آفرینش ہے، یہ نقوش تابندہ رہیں گے اور کبھی کبھی دبے الفاظ میں یہ بھی کہہ جائیں گے کہ

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ندوہ کے ساتھ دارالمصنّفین کے وہ عاشق تھے، وہ اور ان کے بھائی ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین بھی جو سعودی عرب میں ہیں، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ نے اپنے سفر حج میں ان کا ذکر کئی بار کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

ع-ص

باب التقریظ والانتقاد

صحیح بخاری کا نسخہ موحدہ
ایک جاوداں تحقیقی کارنامہ

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

منظر و پس منظر: حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری (اللہ جل شانہ ان کے فیضان معرفت کو بہ صحت و عافیت تادیر سلامت رکھے) کی شخصیت اور ان کے مثل شہاب ثاقب علمی کارناموں کے بارے میں کلاہ دہقاں بہ آفتاب رسید کے مصداق ایک نذرانہ اخلاص و عقیدت سپرد قلم کرچکا ہے۔ لاریب حضرت مخدوم نے عہد پیری میں ''مانند سحر رنگ شباب''، تحقیقی جانکاہی اور تلاش و جستجو کی عرق ریز محنت کے ایسے درخشاں نقوش ثبت کیے ہیں، جو ان کو بقائے دوام کے دربار میں صف پیشیں میں نمایاں مقام عطا کرتے ہیں۔

گذشتہ دنوں عاجز بے مایہ کے ستارۂ بخت و اقبال کو ایک بار پھر اوج ثریا نصیب ہوا اور حضرت الاستاذ مخدوم نے اپنے اس تلمیذ بے بضاعت کو پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل صحیح بخاری کے اس نسخہ موحدہ کا پورا سیٹ ہدیتاً عنایت فرمایا جس پر وہ سالہا سال سے تحقیق و تعلیق کی عرق ریز محنت فرمارہے تھے۔ اس کی کماحقہ فنی قدر و قیمت تو اسی معیار کے اہل علم ہی متعین کرسکتے ہیں اور اس خصوص میں عاجز کو اپنی بے مائیگی کا پورا ادراک ہے، تاہم اس کتاب کے گراں قدر مقدمات اور ایک سرسری جائزہ کی روشنی میں عاجز راقم سطور ذیل میں اپنے تاثرات اور شدت جذبات و احساسات کو رقم کرتا ہے، تاکہ خریداران یوسف کی فہرست میں اس سیہ کار کا نام بھی شامل ہوجائے

سابق رفیق دارالمصنفین، ابوظبی۔

کہ یہ سعادت بھی ایک عظیم عطیہ ربانی ہے۔

بلاشبہ یہ ایک ازلی وابدی حقیقت ہے کہ تاریخ انسانی کی تمام نابغہ زمن شخصیتوں نے رفعت وشہرت کی چوٹیوں کو چھونے کے لیے اپنے پیکر وجود کو محنت شاقہ، مقصد سے نہایت عمیق وابستگی اور فنائیت نفس کی بھٹی میں رہتی زندگی تپایا ہے، تب جا کر رازی وغزالی، ابن تیمیہ وابن قیم، شاہ ولی اللہ وشیخ الحدیث مولانا زکریا اور شبلی وسلیمان ہماری علمی تاریخ میں کندن بن کر چمکے ہیں حضرت الاستاذ مخدوم مولانا تقی الدین ندوی کی جلالت علمی اور علوئے مرتبت کا راز بھی علم حدیث کے بحر بیکراں سے بیش قیمت لولو ومرجان نکالنے کے لیے کاوش مسلسل اور جہد متواصل میں مضمر ہے۔ یہاں عاجز بلاخوف تردید عرض کرتا ہے کہ حضرت مخدوم نے **بذل المجهود** اور **التعليق الممجد** کی تحقیق وتعلیق کے بعد اب **الجامع الصحيح للامام البخاري** کا ایک مستند ومعتبر نسخہ پیش کر کے متذکرۃ الصدر اصفیائے امت اور زبدۂ عصر اکابر کی صف اول میں ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔

عاجز نے مولانا مناظر احسن گیلانی کا یہ قول کہیں پڑھا تھا کہ ''ہندوستان کے ایک ایک عالم نے تن تنہا ایسے گراں قدر علمی کارنامے انجام دیے ہیں جو یورپ میں پوری پوری اکیڈمیاں انجام دیتی ہیں'' اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت مخدوم کی تحقیقی خدمات اس دعوی کا بین ثبوت ہیں۔ عمر رواں کے اس مرحلہ شیخوخت میں، جب انسان ہر دماغی کام میں عجز وتعب محسوس کرتا ہے، وہ ایک محیر العقول دھن اور لگن کے ساتھ اور شدت مواسم کی پروا کیے بغیر مضامین نو کے انبار لگائے چلے جارہے ہیں۔

اہل علم سے مخفی نہیں کہ کسی خالص علمی موضوع پر ٹھوس تحقیقی کام کتنی پتہ ماری اور ریزہ چینی کا طالب ہوتا ہے، بقول علامہ شبلیؒ یہ عمل ''چیونٹیوں کے منہ سے شکر کے دانے اکٹھا کرنے کے مرادف ہے''۔ اور صحیح بخاری کا پیش نظر نسخہ موحدہ اس کی بہترین مثال ہے۔ بلاشبہ دنیا کے کونے کونے میں منتشر بخاری شریف کے تمام نسخوں کا تقابل کر کے ایک نسخہ موحدہ تیار کرنا دراصل کوہ کنی کر کے جوئے شیر نکالنے کے مرادف ہے، عاجز تمام تر جذبات فخر ومسرت کے ساتھ یہاں اس تحدیث نعمت کا ذکر کرتا ہے کہ اس جوئے شیر کا فرہاد بننے کا تمغہ امتیاز استاذ گرامی

قدر جناب مولانا تقی الدین ندوی کے سینہ پر آویزاں اور بہت خوبصورتی سے آویزاں ہے۔ اللہ ان کے سایہ عاطفت کو بہ صحت و عافیت تادیر سلامت رکھے۔

عاجز جب بھی نصف صدی قبل کی عمر رفتہ کو آواز دیتا ہے تو حضرت مخدوم کے درس حدیث، علمی انہماک اور کثرت مطالعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، بیسویں صدی کی چھٹی دہائی حضرت کے عین ریعان شباب کا زمانہ تھا، انگ انگ متحرک اور ''ہر دم رواں پیہم دواں ہے زندگی'' کا مرقع بنا ہوا تھا، ان کی عقاب نظری اور شاہین فکری اس زمانہ میں بھی بلند پرواز تھی۔ عاجز بے مایہ نے ۱۹۵۸ء کے اواخر میں دارالعلوم ندوہ کے درجہ اول میں داخلہ لیا، برس بارہ کہ تیرہ کا سن رہا ہوگا، حضرت مخدوم سے عاجز کے تلمذ کا آغاز درجہ اول میں مولانا علی میاںؒ کی درسی ریڈر ''قصص النبیین للاطفال'' سے ہوا اور پھر طائر لیل ونہار کی سرعت پرواز کے ساتھ ان سے شرف تلمذ بھی مسلسل پروان چڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ درجہ پنجم عالمیت میں کاتب ازل نے عاجز کے دفتر نصیب کا ورق الٹا اور حضرت مخدوم سے ترمذی شریف کامل پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ (اس درس حدیث کی روحانی کیفیت راقم سطور گزشتہ مضامین میں تفصیل سے عرض کرچکا ہے)

حضرت مخدوم کو اپنی گراں پلہ علمی تحقیقات کے باعث آج عالم اسلام اور دنیائے علم و فن میں جو اوج و رفعت حاصل ہوئی ہے، عاجز کی ناچیز رائے میں اس کی پشت پر دو عوامل کارفرما ہیں، ایک تو دعائے سحر گاہی پر دوام کہ ''کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی''۔ (عاجز کو آج کو بھی بخوبی یاد ہے کہ وقت سحر گاہی ان کے ذکر جلی کی ضربوں سے پورے ماحول کی جلائے قلب اور تزکیہ نفس ہوجایا کرتی تھی) اور حضرت کی علوے مرتبت کا دوسرا عامل ان کی اپنے استاذ و شیوخ کی ذات میں کامل فنائیت اور نفس شکنی کے ساتھ خدمت ہے۔ اور لاریب یہی دو اعلیٰ صفات انسان کی رفعت و علو کی ضمانت ہوا کرتی ہیں۔

یہاں عاجز اس کے دو شواہد پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے کہیں لکھا ہے کہ ''میں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ان کے عین اوج شہرت کے زمانہ میں خود دیکھا کہ وہ اپنے سر پر پانی سے بھرا مٹکا اٹھائے اپنے استاذ حضرت شیخ الہندؒ کے گھر چلے جارہے ہیں''۔ اور بلاشبہ

اپنے شیخ کی اسی بے نفس خدمت اور کامل طاعت وانقیاد کے باعث وہ آسمان علم ومعرفت پر آفتاب بن کر چمکے اور زبان خلق نے نقارۂ خدا بن کر ان کو ''شیخ الاسلام'' کا لقب عطا کیا۔ چند سال قبل عاجز راقم سطور کو دیوبند میں ''قبرستان قاسمی'' کی زیارت نصیب ہوئی، تو حضرت شیخ الہندؒ کی قبر کے پہلو میں حضرت مدنیؒ کا مزار دیکھ کر بڑی بصیرت حاصل ہوئی۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ جس زمانہ بذل المجہود کی تالیف میں مشغول تھے، تو اس عظیم الشان علمی کام میں ان کے شاگرد رشید مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ نے نہایت بھرپور تعاون کیا اور فنا فی الشیخ ہوکر شب و روز عرق ریز اور جانکاہ محنت کی اور مصادر تحقیق سے مراجعت کر کے اپنے منتخب عہد شیخ کو قیمتی مواد فراہم کیا، خلیل وقت حضرت سہارن پوری تلمیذ رشید کی اس سعادت و طاعت سے اتنا سرشار ہوگئے کہ کتاب مذکور کے مقدمہ میں بصراحت اس تالیف کا سہرا اپنے تلمیذ رشید کے سر باندھ دیا۔ اور یہ اسی کا ثمرہ تھا کہ مشرق سے مغرب تک خلق خدا نے ان کو ''شیخ الحدیث'' کے لقب سے نوازا، جو ان کے اصل نام سے زیادہ شہرت یاب ہوا۔

عاجز کے استاذ و مربی خاص حضرت مولانا تقی الدین ندوی (**متعنا اللہ بطول حیاتہ**) بھی اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں، کون نہیں جانتا کہ حضرت ممدوح نے اپنے استاذ و شیخ باصفا شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی خدمت و طاعت میں خود کو فنا کر کے رکھ دیا تھا، راقم سطور اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر ہمیشہ عرض کرتا رہا ہے کہ استاذ اور تلمیذ رشید کے درمیان اتنے عمیق تعلق خاطر کی نظیر ماضی قریب کی تاریخ میں خال خال ہی ملتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ کے حکم وایما پر وہ ایک سال تک مصر میں مقیم رہ کر **اوجز المسالک** کی طباعت و تصحیح کا اہتمام کرتے رہے، حضرت مخدوم نے نہ صرف شیخ الحدیث کی حیات میں کامل فنائیت کا ثبوت دیا، بلکہ ان کی وفات کے بعد بھی وہ مسلسل اپنے شیخ کی یادوں کے چراغ روشن رکھنے میں لگے ہوئے ہیں اور بلاشبہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے آج ان کو دین و دنیا دونوں کے بڑے گراں قدر کام انجام دینے کی توفیق و سعادت نصیب کر رکھی ہے، جو ان کی بلندی درجات کا باعث ہیں، چنانچہ حضرت ممدوح کی کتاب صحیح بخاری کی تعلیق و تحقیق وہ عظیم کارنامہ ہے جو ان کو محدثین سلف کی صف میں کھڑا کر دیتا ہے۔

الجامع الصحیح للبخاری کانسخہ موحدہ: بلاشبہ یہ کتاب بھی **بذل المجھود** اور **التعلیق الممجد** کی طرح حضرت الاستاذ مخدوم کا وہ جاوداں علمی وتحقیقی کارنامہ ہے جس میں وہ گزشتہ پانچ سال سے جانکاہ محنت اور پر مشقت جدو جہد فرما رہے تھے، اس عرصہ کے دوران اس اہم کام کی تکمیل کی شدید ترین فکر ان کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح غالب ہوگئی تھی کہ صحیح معنوں میں خواب وخور کا ہوش نہ رہ گیا تھا۔اس بے مایہ عاجز کو ابوظبی فون کرکے برابر اپنی شدت فکر کا اظہار فرماتے رہتے تھے۔ بحمد اللہ ان کی یہ محنت و کاوش آج نہایت شوکت و بہجت کے ساتھ منصۂ شہود کی زینت ہے۔

یہاں پیش نظر کتاب کی مناسبت سے غالباً اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرت الاستاذ مخدوم نے ۱۹۶۲ء میں جب تحریر وتالیف کے میدان میں قدم رکھا تو اس کا آغاز بھی اردو میں ایک مبسوط مضمون بعنوان ''امام بخاری اور ان کی علمی خدمات'' سے کیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ حضرت کی ادبی زندگی کا نقطۂ آغاز یہ مضمون قدیم مستند مصادر ومراجع کے قیمتی حوالوں سے مزین اور تحقیقی معلومات کا خزانہ تھا۔اس مضمون کو دارالمصنّفین کے اس وقت کے ناظم شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے بہت پسند کیا اور رسالہ ''معارف'' میں بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، عاجز اپنی اس سعادت پر رہتی زندگی مفتخر رہے گا کہ حضرت مخدوم نے اپنے مذکورہ مضمون کا مسودہ تبییض کے لیے اس کے حوالہ کیا اور راقم کے بعض جرات اندیشانہ معمولی تعدیلات کو ازراہ خوردنوازی پوری وسعت قلبی کے ساتھ قبول فرمالیا تھا۔ بہرحال اس عرض گزاری کا حاصل یہ ہے کہ ۲۰۱۱ء میں شائع ہونے والی پیش نظر عظیم کتاب ''الجامع الصحیح'' کی تخم ریزی دراصل نصف صدی قبل ۱۹۶۲ء میں ہی مذکورہ مضمون کے ذریعہ ہوچکی تھی۔

صحیح بخاری کے پیش نظر نسخہ موحدہ کا آغاز حضرت مخدوم کے فاضلانہ مقدمہ سے ہوتا ہے۔**اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ** کے ساتھ عالمی سطح پر جو غیر معمولی اور عدیم المثال اعتنا کیا گیا ہے، محقق علام نے اس پر نہایت اعجاز نما ایجاز اور جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ''صحیح بخاری کی اہمیت وعظمت کے باعث پورے کرۂ ارض کے علمی ودینی حلقوں میں اس کو جو قبول عام اور شہرت خاص حاصل ہوئی، اس کے باعث اس کی شروح وتعلیقات کی

تعداد بقول صاحب لامع الدراری ۱۳۱، اور صاحب اتحاف القاری ۳۷۵ ہے، ''حضرت مخدوم مدظلہ کی رائے ہے کہ ان شروح وتعلیقات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوسکتی ہے اور اس کی توجیہ کو انہوں نے ایک نہایت ہی خوبصورت معراج بلاغت اور جان انشاء جملہ میں ادا فرمایا ہے:
''وفی الزوایا خبایا لم تقع علیھا عین ولم تطلع علیھا شمس'' ۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔

اس کے بعد حضرت مخدوم نے پیش نظر نسخہ بخاری کے شارح شیخ احمد علی سہارن پوریؒ کے ولادت سے وفات تک کے مختصر کوائف زندگی اور ان کی سند اجازت حدیث ذکر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے کہ ''شیخ احمد علی سہارن پوری کو بلا شبہ اس باب میں شرف اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے ۱۸۵۳ء میں صحیح بخاری کو پہلی بار نصوص کی تحقیق اور دیگر نسخوں سے مقارنت کے بعد عالم اسلام کی نذر کیا شیخ سہارن پوری کے پاس بخاری شریف کے بشمول نسخہ امام صغانی اور نسخہ شاہ محمد اسحاق (جو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے پوتے اور تلمیذ رشید تھے) دس نسخے موجود تھے۔ اور انہوں نے اپنی شرح میں شاہ محمد اسحاقؒ کے نسخہ بخاری کو بنیاد بنایا ہے''۔

اس ذیل میں حضرت الاستاذ مخدوم نے بخاری شریف کے مختلف ابواب (مثلاً کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصوم، کتاب الجہاد، کتاب الصلح اور کتاب التفسیر وغیرہ) سے منتخب گیارہ ایسی مثالیں ذکر فرمائی ہیں جن میں شیخ سہارن پوری کی پیش نظر شرح کو (جس کی تکمیل میں دس سال کی طویل مدت صرف ہوئی ہے) امتیاز خاص بلکہ تفرد حاصل ہے، دیگر شروح ایسے بہت سے قیمتی نوادر سے عاری ہیں جو نسخہ سہارن پوری اور نسخہ صغانی میں موجود ہیں۔ حضرت محقق مدظلہ نے مزید برآں ''خصائص شرح'' کے مستقل عنوان کے تحت آٹھ نقاط میں شیخ سہارن پوری کے نسخہ بخاری کے متمیزات پر نہایت جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا تقی الدین ندوی مدظلہ نے اس کتاب کی تحقیق وتعلیق میں جو غیر معمولی کاوش اور جانکاہ محنت وجد وجہد کی ہے، اس کی وضاحت انہوں نے جلد اول کے صفحہ ۲۸ پر دس نقاط میں کی ہے، جس کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ محقق علام نے تخریج احادیث، بکثرت مصادر سے مراجعت، نسخہ سہارن پوری اور دیگر نسخوں سے مقارنہ اور قیمتی نوادرو

تعلیقات کا اضافہ کرنے میں کتنی عرق ریز اور پتہ مار محنت کی ہے۔

حضرت ممدوح کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ صحیح بخاری کا پیش نظر نسخہ موحدہ تین اکابر عصر کے مقدمات سے مزین ہے، ان سب نے بالا جماع محقق علام کی رول ماڈل کدو کاوش کی کھل کر تحسین کی ہے۔ چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی اپنے مبسوط مقدمہ میں حضرت کی سابقہ علمی خدمات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''ہمارے بھائی اور فاضل دوست ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اپنے پوری زندگی علوم حدیث کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہے۔ **بذل المجهود** ، **اوجز المسالک** اور **الزهد الكبير** پر موصوف کی گراں قدر تعلیق و تنقیح اس کی بہترین مثالیں ہیں، وہ بلا شبہ میدان تحقیق و تالیف کے ایک بلند حوصلہ و باہمت شہسوار اور بحث و جستجو کی راہ پر تعب و مشقت کے خندہ جبیں سالک ہیں۔ جس نے بھی **التعليق الممجد** اور **ظفر الامانی** پر ان کی بیش قیمت تعلیقات کا مطالعہ کیا ہے، وہ فن حدیث میں ان کی مہارت تامہ و معرفت کاملہ اور وسعت مطالعہ کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہے گا۔ اللہ جل شانہ موصوف کو اجر جزیل اور ان کی عمر و اوقات میں برکت عطا فرمائے''۔ (جلد اول، ص ۴۰)

اس کے بعد ڈاکٹر تر کی پیش نظر نسخہ بخاری کی تحقیق و تحشی اور خوبصورت طباعت کے بارے میں نہایت والہانہ اور انشاء پردازانہ انداز میں خامہ ریز ہیں۔ ''اور اب انہوں نے (ڈاکٹر تقی الدین ندوی) نے اہل علم اور اساتذہ و طلبہ حدیث کی خدمت میں ایک نئے خوبصورت لباس میں (صحیح بخاری پر) یہ حواشی و تعلیقات پیش کیے ہیں۔ اس کے ثمار پاکیزہ، اس کے فوائد سے استفادہ ہر شخص کی دسترس میں اور اس کا ذائقہ خوش گوار و لذت بخش ہے۔ بلاشبہ یہ حواشی و تعلیقات محقق کی کئی دہائیوں پر محیط محنت کا ثمرہ ہیں، اس میں انہوں نے دراصل اپنی ریسرچ و تحقیق کے نصف صدی سے زائد عرصہ کے تجربات کا عطر سجا کر رکھ دیا ہے۔ وہ لاریب علم حدیث سے رغبت و شغف رکھنے والے ہر شخص کے شکریہ و قدر افزائی کے مستحق ہیں''۔ (جلد اول، ص ۴۱)

صحیح بخاری کے پیش نظر نسخہ موحدہ پر دوسرا نہایت معلومات افزا مقدمہ (جو تقریباً بیس صفحات پر مشتمل ہے) عاجز راقم سطور کے استاذ گرامی قدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کے خامہ عنبر فشاں کا ثمرۂ فکر ہے، اس کے آغاز میں استاذ گرامی نے شریعت اسلامی میں حدیث

کی اہمیت کو نمایاں فرمایا ہے، پھر صحاح ستہ میں صحیح بخاری کی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے مایہ فخر جامع امام بخاری کے مختصر کوائف حیات بھی تحریر کیے ہیں۔اس کے بعد شیخ احمد علی سہارن پوری کی علمی بلندی شان اور ان کے نسخہ بخاری کے بنیادی امتیازات کو مبرہن کیا ہے، پھر آخر میں حضرت مخدوم مولانا تقی الدین ندوی کی علم حدیث میں فنی مہارت و جدارت اور اس میدان میں ان کی نصف صدی پر محیط علمی و تحقیقی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان عالی مرتبت محدثین ہند کی یاد بھی تازہ کی ہے، جن کے خرمن فضل و کمال سے خوشہ چینی کر کے استاذ ممدوح کی شخصیت کو اوج ثریا حاصل ہوا ہے۔

چنانچہ استاذی مولانا رابع صاحب مدظلہ نے اپنے خامہ عنبریں کی پوری قوت اور عربی زبان پر کامل ادیبانہ قدرت کے ساتھ لکھا ہے کہ ''مولانا تقی الدین ندوی کا شمار ہندوستان کے ممتاز ترین علمائے حدیث میں ہوتا ہے، ندوۃ العلماء سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد سے تادم تحریر یعنی گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ حیات میں فن حدیث ان کے فکر و نظر، درس و افادہ اور تحقیق و تالیف کا خصوصی جولان گاہ رہا ہے۔چنانچہ ان کے قیمتی حواشی و تعلیقات کے ساتھ اب تک **بذل المجھود** ، **اوجز المسالک** ، **التعلیق الممجد** اور **ظفر الامانی** وغیرہ حدیث کی متعدد اہم کتب طبع ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں''۔

اور اب موصوف نے صحیح بخاری نسخہ احمد علی سہارن پوری کا متعدد دیگر نسخوں سے مقارنہ کر کے اپنی گراں قدر تحقیق و تعلیق کے ساتھ شائع کیا ہے اور بلا مبالغہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ڈاکٹر تقی الدین ندوی نے اس کام میں عدیم النظیر جانکاہ اور عرق ریز محنت کی ہے۔انہوں نے دنیا کے کونے کونے سے شروح بخاری کے مختلف نسخوں کو جمع کر کے یہ نسخہ موحدہ تیار کیا اور پورے عالم اسلام خاص طور پر علم حدیث سے شغف رکھنے والے اہل علم کو ایک دیدہ زیب اور نادر تحفہ عطا کر دیا ہے، جس کے لیے وہ بجا طور پر ہر شکر و تقدیر کے مستحق ہیں۔اللہ جل شانہ موصوف کی اس خدمت کے طفیل ان کے میزان حسنات کو گراں پلہ بنائے''۔

حضرت الاستاذ مخدوم کی نظر تحقیق و تعلیق پر تیسرا مقدمہ جامعۃ الامارات کے استاذ حدیث ڈاکٹر ابولبابہ الطاہر حسین کا ہے، جو زبان و بیان پر عربوں کی روایتی قدرت کا شاہ کار ہے،

موصوف نے صحیح بخاری کے نسخہ سہارن پوری کی اہمیت وندرت کو نمایاں کرتے ہوئے محقق علام مولانا تقی الدین ندوی مدظلہ کی فنی مہارت حدیث اور جی توڑ کدو کاوش کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ وہ بے حد سرشارانہ انداز میں رقم طراز ہیں کہ:

''علامہ تقی الدین ندوی تالیف وتحقیق اور حفظ وتدریس حدیث کے ایک ماہر شہسوار ہیں، انہوں نے اس عظیم الشان کارنامہ کا سہرا زیب سر کرنے کے لیے نصف صدی تک لگاتار جد وجہد اور بے انتہا جان کی بازی لگائی ہے اور پھر اسلامی ذخیرہ کتب کو ایک بیش قیمت اور نادر تحفہ سے مالا مال کردیا ہے، علامہ ندوی نے علم حدیث کے محققین کو ایک ایسی بیش قیمت کتاب عطا کردی ہے جس سے وہ کبھی مستغنی نہیں ہوسکتے۔ لاریب انہوں نے نہایت عام فہم اسلوب میں صحیح بخاری کی تعلیق وتحشی کا یہ دیدہ زیب نسخہ موحدہ تیار کرکے ہر شخص کے لیے اس سے استفادہ کو آسان بنادیا ہے، اس عظیم پیش کش کا اجر ان کو صرف اللہ جل شانہ ہی عطا فرماسکتے ہیں، ہماری دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ موصوف کو بہترین جزائے خیر اور نعمت رضوان سے مالا مال فرمائے''۔

اس مضمون کے حسن ختام پر عاجز راقم سطور کا پورا وجود فخر ومسرت اور عز ومسرت اور عز وافتخار کے جذبات سے سرشار ہے، کیونکہ گزشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں اس بے مایہ نے جس استاذ علام کے روبرو مسلسل پانچ سال تک زانوئے تلمذ تہ کیے رکھا، آج اس کے علمی وتحقیق کارناموں کی شہرت ومقبولیت سے پورا گنبد مینا پرشور ہے۔ عاجز حضرت مخدوم سے برابر عرض گزار رہتا ہے کہ ان کی ترقیات کا عروج اس ناکارہ تلمیذ کے لیے بلاشبہ باعث فخر واعتزاز ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''**الدرر الکامنہ فی اعیان المأۃ الثامنۃ**'' میں اپنے چار شیوخ کو علمی اعتبار سے ''اُعجوبہ روزگار'' اور ''نادرۂ عصر'' قرار دیا ہے۔ یہ پیر کہن سال راقم سطور بلاخوف تردید اپنے استاذ علام مولانا تقی الدین ندوی مدظلہ العالی کے بارے میں صاحب فتح الباری کے مذکورۃ الصدر القاب کا استعمال ''حق بہ حقدار رسید'' کا مصداق سمجھتا ہے۔ آخر میں عاجز کو صمیم قلب سے اپنے اس عجز کا اعتراف ہے کہ وہ پیش نظر مضمون میں حضرت مخدوم کے علمی کارناموں کا فنی تجزیہ کرنے سے قاصر رہا ہے۔ **وما توفیقی الا باللّٰہ**۔

ادبیات

نعت

پروفیسر الطاف احمد اعظمی☆

جلوہ نمائے گنبد خضرا ہیں آپؐ ہی
خوابیدہ زیر خاک ''مدینہ'' ہیں آپؐ ہی

پتھر پہ بھی کھلائے گل و لالہ ، نسترن
رونق فزائے وادی بطحا ہیں آپؐ ہی

ہر لحہ گوش شوق میں آتی ہے یہ صدا
مکہ کی شان ، روح ''مدینہ'' ہیں آپؐ ہی

سردار انبیاءؑ ہیں تو ختم الرسلؐ بھی ہیں
انگشتری دیں کا ''نگینہ'' ہیں آپؐ ہی

کس کو خبر کہ ''جنت ماویٰ'' ہے کیا مقام
دانائے راز عالم ''سدرہ'' ہیں آپؐ ہی

ابر کرم ہیں ، رحمت پروردگار ہیں
ہر زخم زندگی کا مداوا ہیں آپؐ ہی

احمدؔ کو آرزوے گل و لالہ کچھ نہیں
اس کے دل و نظر کی تمنا ہیں آپؐ ہی

نعت نبیؐ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی☆☆

پیر و پی سید ابرارؐ خوشبو می دھد
ہر کہ فرمانشؐ برد ، کردار خوشبو می دھد

با خیال اوؐ ، ہمہ افکار خوشبو می دھد
چوں سرایم نعت اوؐ ، گفتار خوشبو می دھد

با خلوص دل در آن جایی کہ خوانندشؐ درود
آن مکان و آن در و دیوار خوشبو می دھد

در شب و روزی کہ می آید نسیم کوی اوؐ
آن شب و آن روز خوش آثار خوشبو می دھد

باد طیبہ ہر کجا در روی گیتی می وزد
دشتہا ، گلزارھا ، کہسار خوشبو می دھد

اندران نامہ کہ گردد سیرت پاکشؐ رقم
آن کتاب و آن ہمہ اخبار خوشبو می دھد

می در آرد گر کسی ، اخیار عالم در شمار
چون بہ نام اوؐ رسد ، آماد خوشبو می دھد

بر نسیم روح بخش باغ طیبہ ، من نثار
کاندران جا گل کہ گل ، ہم خار خوشبو می دھد

می دھد خوشبو زِیادِ اوؐ دل و جان رئیسؔ
چون گل تازہ کہ در گلزار خوشبو می دھد

☆ تغلق آباد، نئی دہلی۔ ☆☆ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

جلوۂ دانش فرنگ: از پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۱۵۰، قیمت ۸۱، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔ یوپی

مغرب کی دانشوری لاکھ بے زمام و بے مقام سمجھی جائے لیکن اس کے جہان میں گردش صبح وشام بہرحال وہی ہے جو مشرق کی دنیا کو زیر زبر کیے رہتی ہے، جب مغرب سے یہ آواز اٹھے کہ ''اقبال اپنے دور کی شخصیت ہیں تاہم اپنے عہد سے ماوراء اور اپنے دور سے غیر مطمئن بھی'' یا یہ کہ اقبال کے افکار کی قدر و قیمت میں یہ امر ہرگز مانع نہیں کہ مسلم ذہن کی انقلابی تبدیلی کے مستقبل میں واقع ہونے کا امکان نہیں یا پھر اقبال پر حلاج کے اثرات کی تلاش میں ع انا الحق گو وصدیق خودشو کی یافت ہو اور یہ نتیجہ اخذ کرنا ہو کہ ''اقبال کے علم وفضل اور فن کی داد دینا ناگزیر سا ہے کیونکہ انہوں نے انا الحق جیسے رسوائے زمانہ اور خطرناک نظریہ کے علاوہ حلاج کے دیگر نظریات سے بحث کی'' تو اطمینان کی کیفیت کا احساس ہوتا ہی ہے علامہ اقبال کے متعلق فوسٹر، نکلسن، ہربرٹ ریڈ، این میری شمل جیسے علمائے استشراق کے اس مطالعہ وتجزیہ میں یہ تو معروف ہے کہ اقبال کی آنکھ کا سرمہ خاک نجف و مدینہ ہے جس سے جلوہ دانش فرنگ ان کو خیرہ نہ کر سکا لیکن فاضل مترجم جو خود انگریزی ادبیات کے ماہر اور استشراق کی اصل روح سے آشنا ہیں کا یہ قول ان کی بصیرت کا ترجمان ہے کہ ''خود دانشوران فرنگ کی نگاہیں اقبال کے فکر وفن کے جلوہ ہائے رنگارنگ سے خیرہ ہوئیں'' اس کتاب کے مضامین اسی دعوے کی دلیل ہیں، بعض مضامین کے ترجمے پہلے بھی ہو چکے ہیں لیکن فاضل مترجم ترجمہ کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں، ان کے اسلوب میں ادبی آہنگ اور فکر میں مذہبی رنگ، موروثی ہے اسی لیے اس کا اظہار بھی فطری ہے، مذکورہ مستشرقین کے مضامین کے علاوہ علامہ اقبال کے دو مضامین الجیلی اور نظریہ وحدت مطلق اور بیدل برگساں کی روشنی میں بھی شامل ہیں اور ان سب پر مستزاد پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا بڑا قیمتی مضمون اقبال کا تصور خدا بھی ہے بقول لائق مترجم ''یہ مغربی فکر سے اقبال کے استفادے اور اسلامی نقطہ نظر سے اس سے احتیاط اور گریز کے فکر انگیز گوشوں کو نمایاں کرتا ہے'' آخر میں کتابیات کے تحت کلام اقبال کے مغربی زبانوں میں تراجم اور اقبالیات پر مغربی اہل قلم کے تنقیدی مضامین نے کتاب کی اہمیت میں بڑا اضافہ کر دیا ہے۔ ع-ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- **آخری سورتوں کے درس، سورۃ الشّمس تا سورۃ التکاثر**: خرم مراد، ادارہ تذکیر القرآن، سرائے میر اعظم گڈھ۔ قیمت درج نہیں۔

۲- **اسلام اور جدید سائنس**: علامہ محمد شہاب الدین ندوی مرحوم، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔ قیمت درج نہیں۔

۳- **خانوادۂ قاضی بدر الدولہ (حصہ دوم)**: عبید اللہ ایم اے، ۴۴ پدو پیٹ گارڈن اسٹریٹ، رانی پیٹھ چنئی ۱۴۔ قیمت درج نہیں۔

۴- **دریائے نیل کے کنارے کنارے**: محمود الرحمٰن فاروقی ندوی، فرید بک ڈپو (پرائیوٹ) لمیٹڈ، دہلی۔ قیمت ۶۰ روپے

۵- **ذرا سوچئے**: زیر نگرانی مفتی صغیر نعمانی۔ مطبع، ناشر اور قیمت درج نہیں۔

۶- **سوانح حضرت مولانا ابرار الحق حقی**: محمود حسن حسنی ندوی، صدق فاؤنڈیشن لکھنؤ، مکتبہ ندویہ، ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت ۷۰ روپے۔

۷- **سید قطب۔ ایک ادیب، ایک صحافی**: ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری، شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ قیمت ۹۰ روپے۔

۸- **شاہ ولی اللہ کے مآخذ کتب وشخصیات**: پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، حضرت شاہ ولی اکیڈمی، پھلت / مکتبہ شاہ ولی اللہ ۲۵ / B1 رحمان کامپلیکس بٹلہ ہاؤس چوک جوگا بائی، جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

۹- **مقالات عباس (ادبیات فارسی سے متعلق مقالات کا مجموعہ، جلد اول)**: ڈاکٹر سید حسن عباس، مرکز تحقیقات اردو و فارسی، گوپال پور، باقر گنج سیوان، بہار۔ قیمت ۱۵۰ روپے۔

۱۰- **میری علمی زندگی کی داستان عبرت**: علامہ محمد شہاب الدین ندویؒ، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔ قیمت درج نہیں۔